# فہرست مضامین حدیثِ دل


۱۔ابتدائیہ

۲۔اسلام اور مغربی جمہوریت

۳۔عیدالفطر اور عید کارڈ

۴۔شہادت و خلافت

۵۔مشکلات اور اس کا حل

٦۔چلو اپنے رب کی طرف

۷۔امام اور چور

۸۔ گر تو برا نہ مانے

۹۔روشنیوں کا شہر

۱۰۔نشانِ راہ

۱۱۔تلاش حق

۱۲۔سفر شہادت

۱۳۔اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا

۱۴۔اک فتاب بھری دوپہر میں ڈوب گیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَن ضَلَّ عَن سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ

تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہی ان کو بھی خوب اچھی طرح جانتا ہے جو راہِ راست پر ہیں لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ (القلم ۷۔۸)

# انتساب

عظیم والدین کے نام

جن کے زیرِ سایہ

حدیثِ دل کا بیان سیکھا

# ابتدائیہ

اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے میں اس کتاب کے مصنف کے بارے میں چند جملے لکھنا چاہتا ہوں۔ بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ ایک اعلیٰ انجینئر، ایک درد مند محب وطن پاکستانی، ایک صاحبِ اسلوب ادیب اور شعر وادب کا دلدادہ شخص جو وطن سے دور بیٹھ کر غیر ملکی خاص طور پر انگلستان کے اخبارات میں تسلسل کے ساتھ پاکستان کی محبت کی سرشاری کے ساتھ مضمون لکھتا ہے۔ لندن کے بڑے بڑے اخبارات میں یہ مضامین اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔اسی تسلسل کے ساتھ اردو میں شائع ہونے پاکستانی وبیرونی اخبارات وجرائد میں بھی اپنے وطن عزیزاوراس کے مسائل کے بارے میں ان کے فکرانگیز مقالے، مضامین، خطوط اورانشائیے چھپتے رہتے ہیں۔

مجھے ان کی زندگی کے اس پہلونے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ ہمارے بہت سے بھائی بیرون ملک جاکراپنے وطن کی مٹی کو بھول گئے۔ وطن کی ہواؤں، فضاؤں سے ناتا توڑلیااور بیرون ملک اپنی آسودگیوں میں کھوکررہ گئے...... مگر کچھ اہل دل ایسے بھی ہیں کہ وطن سے ہزاروں میل دور صبح اٹھتے وقت وطن کی خیر اور رات کو سونے سے پہلے وطن کی سلامتی اور سربلندی کی دعائیں مانگتے ہیں ۔ ان کے قدم دیارِ غیر ہیں مگر ذہن اور دل دن رات وطن کی فضاؤں میں گم رہتے ہیں۔ کبھی کبھی دل ودماغ کے ہاتھوں مجبور ہو کر وطن کو لوٹتے ہیں، اپنی سرزمین پر پہنچ کر اس کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بناتے ہیں، اس زمین پر گھومتے پھرتے ہیں جس کے ساتھ وابستگی ہم سب کیلئے اعزاز ہے۔ سمیع اللہ ملک بھی ایسے ہی درد مند پرجوش محب وطن شخص ہیں۔ وطن کیلئے ہر وقت نقدزر سے لیکر نقدجاں تک ہر چیز نثار کرنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ علم وادب خاص طور پر دینی علوم پر گہری نظر ہے۔ عرب سرزمین میں طویل قیام کے دوران حیرت انگیز عبور حاصل کیا ہے۔ اردو، انگریزی، عربی، پنجابی، یونانی اور ترکی زبان میں یکساں سادہ روانی سے مافی الضمیر کا زبانی وتحریری اظہار کرتے ہیں۔

اس کتاب میں سمیع اللہ ملک صاحب کے کچھ مضامین، کچھ انشائیے، کچھ مراسلے اور حدیثِ دل کے کچھ اظہاریے شامل ہیں۔ یہ مضامین وہ ہیں جو مختلف اردو کے مختلف اخبارات اور جریدوں میں نمایاں طور پر چھپتے رہے ہیں۔ ان مضامین میں اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار اور واقعات کے بارے میں بہت سے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ سمیع اللہ ملک نے دینی علوم کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے ۔انہوں نے کشادہ نظر مبصر اور تجزیہ نگار کے طور پر اسلامی تاریخ کے ابتدائی اور وسطی ادوار کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور ایک روشن خیال مفکر کی حیثیت سے تاریخ کے وہ رخ بھی پیش کر دیئے ہیں جن کے بارے میں کم لوگ جانتے ہیں، بعض باتیں تو واقعی چونکا دیتی ہیں۔ کچھ مضامین عصرِ حاضر کی مغربی تہذیب وتمدن کے بارے میں ہیں۔ سمیع اللہ ملک ان صاحبِ نظر افراد میں سے ہیں جو اشیاء کی ظاہری چمک ودمک سے متاثر ہونے کی بجائے ذہن ودل کے وجدان اور بصیرت پر یقین اور اعتماد کو برقرار رکھتے ہیں۔

اس کتاب کے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور فکر انگیز خیالات کے علاوہ مجھے سمیع اللہ ملک صاحب کے اسلوبِ بیان نے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ میں خود علم و ادب کا خاص کر اردو ادبیات کا ایک دیرینہ طالب علم ہوں، اس بناء پر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اسلوبِ بیان ایک ایسے شخص کا ہی ہو سکتا ہے جس نے مختلف علوم خاص طور پر ادبیات کا وسیع طور پر مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اسحاق کے نام مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

"تاروں کے حسن کا جھومر ظلمتِ شب کی سیاہ پیشانی پر ہی کھلتا ہے۔ چاند کا کنگن رات کی دلہن کو ہی میسر آتا ہے اور بارش کے قطرے کیلئے تپتی ہوئی زمین کا پیاسا دامن ہی سمندر کے لبریز پیمانے سے زیادہ مستحق، طالب اور شائق ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔" یہ اسلوبِ بیان ان مضامین میں زیادہ بے ساختہ اور نمایاں دکھائی دیتا ہے جو ذاتی تاثرات پر مشتمل ہیں اور تخلیقی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ خاص طور پر اپنے پرانے رفیق عتیق راجہ کے جواں عمر بیٹے محمد عمر کے دورانِ جہاد شہادت پر جو خط لکھا ہے وہ نثر میں لکھے جانے والے نادر مرثیہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کا خاص پہلو یہ ہے کہ سوز و گداز سے بھرپور اس تحریر میں غم و اندوہ کے بیان کے ساتھ شہادت کے اعلیٰ مقصد کے درجات اور ارفع ثمرات اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ افسردہ اور غمگیں دلوں کو حوصلہ اور حادثات کو کشادہ دلی سے برداشت کرنے کی توانائی ملتی ہے۔

اس کتاب میں ذاتی دکھ درد اور قلب و نظر پر گزرنے والی دردناک کیفیات کا سب سے بھرپور اظہار ملک صاحب کے ان دو مضامین میں ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے والدِ محترم اور والدہ مرحومہ کی یاد میں لکھے ہیں۔ یہ دونوں مضامین کتاب کے دوسرے مضامین سے بالکل الگ اور جدا کیفیات کے مظہر ہیں۔ ملک صاحب نے زندگی کا بے سروسامانی کا ابتدائی عرصہ اپنے عظیم و شفیق والد جناب حبیب اللہ ملک کے زیرِ سایہ گزارا۔ کشمیر سے ہجرت کر کے (لائلپور) فیصل آباد کے ایک مکان کے ایک کمرے میں پورے خاندان نے جس طرح پر آشوب و تنگدستی کے ساتھ زندگی گزاری اور پھر والد کی دن رات محنت اور شفقت کے سایہ میں سمیع اللہ ملک اور دوسرے بہن بھائیوں کی زندگیاں جس طرح سنوریں اور زندگی کی ہر قسم کی آسودگیاں نصیب ہوئیں وہ محض ایک عظیم اور شفیق باپ کی بھرپور محبت اور رہنمائی سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں لیکن صد افسوس کہ والد کا سایہ بھی کمسنی میں ہی سر سے اٹھ گیا۔ یہ تذکرہ بہت دلچسپ بھی ہے اور دلگداز بھی!

والد مرحوم کی یاد میں عقیدت و نذرانہ پر مشتمل یہ مضمون خاصا طویل ہے مگر اردو زبان و ادب میں اسی طرح ایک اہم اضافہ ہے جس طرح والدہ محترمہ کی یاد میں حضرت علامہ محمد اقبال کی مشہور نظم یا اسی نوعیت کے دوسرے ادب پارے شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اسی نوعیت کا دوسرا مضمون والدہ مرحومہ کی یاد میں ہے جس کا عنوان ہی "اک آفتاب بھری دوپہر میں ڈوب گیا" ان کی دلی کیفیت کے غم و درد کا ایک حسین امتزاج معلوم ہوتا ہے! انتہائی سادہ مزاج، سادہ دل، عظیم مشرقی ماں کی یاد میں جس نے انتہائی بے سرو سامانی اور بیوگی کی حالت میں صبر و تحمل اور اپنے اللہ کے حضور شکر گزاری کے ساتھ بچوں کو اپنے دامن میں سمیٹا اور ان پر جاں

نثاری اور محبت کی گھنی چادر تان دی۔ یہ مضمون اپنی جگہ سوز و گداز سے بھرپور اور والہانہ عقیدت کا خوبصورت اور یادگار مرقع ہے ۔ مرحوم والد کی طرح اس مضمون میں سمیع اللہ ملک کا پرتاثیر اسلوب بیان عروج پر نظر آتا ہے اور قاری کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اس میں شعر و ادب کے بہت برجستہ حوالے اور اشعار ملتے ہیں۔ مضمون کا اختتام بھی ایک انتہائی سوز و گداز میں ڈوبے اس شعر پر ہی ہوتا ہے کہ :

دل کی جن سے تھیں بستیاں آباد

اب کہاں ہیں وہ ہستیاں آباد

مجھے مسرت ہے کہ مجھے سمیع اللہ ملک صاحب کی نثری تخلیقات پر مشتمل اس کتاب کا ابتدائیہ لکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ملک صاحب نے بتایا ہے کہ ان مضامین کو انہوں نے کئی سال پہلے کمپوز کرایا تھا مگر مصروفیت کی بناء پر شائع کرنے کا اہتمام نہیں ہو سکا تھا۔ اس بار لاہور میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کیلئے آئے تو مجھ سمیت کئی دوستوں کے پرزور اصرار پر یہ کام انجام پا گیا۔ مجھے اس بات کی بھی مسرت ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں تھوڑا سا میرا تعاون بھی شامل ہو گیا۔ میری خواہش ہے کہ ملک صاحب دینی علوم و امور کی مکمل ترجمانی کے ساتھ علم و ادب کی مختلف اصناف پر بھی بھرپور وابستگی کے ساتھ توجہ دیں۔ وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔ میں زندگی میں ان کی مزید کامرانیوں کیلئے دعاگو ہوں۔

سرفراز سید لاہور

سوموار ۱۲ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ ۲۰ دسمبر ۱۹۹۹ء

# اسلام اور مغربی جمہوریت

آج کل نہ صرف ہماری نئی نسل اسلام سے عدم واقفیت کی بناء پر مغربی جمہوریت کے نعرے سے مرعوب ہو کر اپنے مسائل کا حل اس میں ڈھونڈ رہی ہے بلکہ ہمارے ملک کے کچھ دانشور قلمکار بھی اس کے پرچار میں مشغول ہیں۔ ضروری ہو گیا ہے کہ اس موضوع پر اپنی بساط کے مطابق کچھ تحریر کیا جائے تاکہ ہماری موجودہ نئی نسل مغرب کے پرفریب نعرے کی حقیقت اور اسلام کی حقانیت سے واقف ہو سکیں۔

اس وقت مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر رکھا ہے۔ محکومی کی وجہ سے تو حاکم کی نظر سے، سنتے ہیں تو حاکم کے کانوں سے، سوچتے ہیں ہماری جان اور بدن بھی غیروں کے ہاں گروی ہیں۔ ہم اگر دیکھتے ہیں تو حاکم کے دماغ سے، یہاں تک کہ ہم قومِ غالب کے نظریہ مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتے ہیں اور اس کی تقلید کو اپنے لئے ہزار فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔ اقوام غالب اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں جب ہماری طرف پھینکتی ہیں تو ہم ان کو لپک کر خوان یغما سمجھ کر اٹھا لیتے ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے فوراً مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفہ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھا کر عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ بکمال فخر و مباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ شروع میں اس نظام کی حیثیت بالکل سیاسی تھی لیکن جب نام نہاد مذہبی پیشوائیت کے سینے میں مذہبی قیادت کے علاوہ سیاسی قیادت سنبھالنے کی کی آرزو نے انگڑائی لی تو انہوں نے سادہ لوح اور تقلید پرست عوام کو سہانے خواب دکھا کر میدان اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے اپنی پوری توانائیاں حصولِ اقتدار کی بھٹی میں جھونک دیں، بجائے اس نظام کو مسترد کرنے کے اس مغربی جمہوریت کو اپنی منزل بنا کر مغربی اقوام کو بھی یہ تاثر دیا کہ گویا اسلام میں "نظام حکومت" کیلئے کوئی واضح ہدایات موجود نہیں۔ اس طرح انہوں نے اس نظام کو جو اقوام مغرب کے قریب مردہ پا چکا تھا عین اسلامی کہہ کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بیشتر تعداد اب مغربی جمہوریت کو عین اسلامی سمجھنے لگی ہے۔

مغربی جمہوریت کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ان حالات و کوائف کا جائزہ لیا جائے جس کے پیشِ نظر مغربی اقوام نے اس نظام کو وضع اور اختیار کیا تھا۔ جمہوریت سے پیشتر مغربی اقوام ظلم و استبداد کی چکی کے دو پاٹوں میں بری طرح پس رہی تھیں۔ ایک طرف ملوکیت کی قہرمانی اور دوسری طرف اربابِ کلیسا کی تھیوکریسی تھی۔ یعنی مذہبی پیشواؤں کی حکومت کا نظریہ جو سینٹ پال نے وضع کیا تھا جس میں تھیاکریسی نے حکومت کا حق خدا سے پادریوں کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ پادریوں کو خدا کا نمائندہ بنا کر ان کو بے پناہ اختیارات کا مالک بنا دیا۔ بعد ازاں رومن بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کر کے حکومت کا اختیار بادشاہوں کو منتقل کر دیا لیکن حقیقتاً حکومت کا کنٹرول پادریوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ لوتھر نے عوام کو پادریوں کے فولادی اور ظالمانہ شکنجے سے رہائی دلانے کیلئے اپنی اصلاحی

تحریک میں انجیل کو سمجھنے کا حق ہر فرد کیلئے مانگا لیکن اس نعرہ سے بھی مسئلہ حل نہ ہو سکا کیونکہ انجیل میں حکومت اور سیاست کے متعلق کوئی قانون موجود نہیں تھا۔

اس صورتحال سے تنگ آکر فرانس میں ایک انقلاب برپا ہوا جس میں روسو کے نظریہ حکومت کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ روسو کے نظریۂ حکومت نے پادریوں اور بادشاہت سے نظامِ حکومت واپس لیکر عوام کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس طرح نظامِ جمہوریت کا ابتدائی تصور سامنے آگیا۔ یہ وہی نظریہ تھا جس کا اساسی تصور یونان کے مفکرین اور دانشوروں نے بہت پہلے پیش کیا تھا۔ بہر حال ملوکیت اور پادریوں کے استبداد کی چکی میں پسنے والے عوام نے اس نظریہ کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کا نہائت گرمجوشی سے استقبال کیا اور اسے نوعِ انسانی کیلئے آیہ رحمت سمجھ کر اس کی تقلید شروع کر دی۔ ظاہر ہے کہ عوام کا جوش و خروش اور مسرت انبساط نظامِ جمہوریت کی کامیابی پر مثبت اظہارِ تشکر نہیں تھا بلکہ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کی قہرمانی سے حصولِ نجات پر ایک منصفانہ رد عمل تھا۔ یہ تھے وہ حالات جس کے پیشِ نظر جمہوریت نے جنم لیا۔

مغربی اقوام نے برسوں اس نظامِ حکومت کا مختلف طریقوں سے تجربہ کیا اور انجام کار ان اقوام کے مفکرین اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس نظام کو انسانیت نے اپنے لئے آیۂ رحمت سمجھا تھا وہ نوع انسانی کیلئے کوئی ازلی و ابدی قانون مبنی بر عدل مہیا نہیں کر سکا کیونکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں ازلیت و ابدیت نہیں ہو سکتی۔ اب یہ مفکرین ان عالمگیر قوانین ، جن کا سرچشمہ انسانی فکر سے الگ اور سربلند و ماورا ہو، کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں اور ہم ہیں کہ ان کے مسترد شدہ نظام یا بامر مجبوری اپنائے ہوئے نظام میں اسلامی لاحقہ لگا کر اسے اپنے دکھوں اور مسائل کا مداوا سمجھ کر سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور اسلامی جمہوریت کے نام سے متعارف کروا کے اپنے ملکوں میں نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔

یہ اصطلاح دراصل ان لوگوں کی طرف سے متعارف ہوئی ہے جو اسلامی جمہوریت کا نعرہ لگا کر اسلام کے پردے میں درحقیقت اپنے جارحانہ مفادات کی حفاظت کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ اس اصطلاح کا بے معنی پن اور استعمال کرنے والوں کی کم علمی یا عدم اخلاص تو خود اس اصطلاح کے اندر پوشیدہ ہے، چاہے اس پر کتنی ہی فلسفیانہ پالش کی جائے۔ اس اصطلاح کا تناقص ہر شخص کی سماعت پر فوراً عیاں ہو جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کون سا جذبہ ہے جس کے تحت "اسلام اور جمہوریت" کے دو متضاد خود کفیل اور جامع مفہوم رکھنے والے دو مختلف الفاظ کو باہم جوڑا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ ایسی متضاد اور متناقض اصطلاح استعمال کرنے والے شخص کا ذہن اسلام کے بارے میں مطمئن نہیں ہے۔ وہ اسے ناکافی 'نامکمل' غیر جامع اور ناقص چیز سمجھتا ہے اور اس کے خیال میں جب تک اسلام میں مزید پیوند نہ لگائے جائیں، اس وقت تک وہ اپنا اصل فائدہ نہیں ظاہر کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ وہ شخص مغربی جمہوریت کے بارے میں مرعوبانہ ذہن رکھتا ہے۔ جو چیزیں وہ اسلام میں کم پاتا ہے، اس کے خیال میں ان چیزوں کی کمی جمہوریت ہی بدرجہ احسن پوری

کر سکتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ایسے شخص کا رحجان غالب مغربی جمہوریت کی طرف ہی ہے اور اسے صرف ذرا اسلامی بنا لینے کی ضرورت ہے۔ شائد یہ ضرورت اسے معاشی یا موجودہ حالات کے پیش نظر لاحق ہو۔ چوتھی بات جس کی طرف ذہن جا سکتا ہے' وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ اس متناقض اصطلاح کو استعمال کرنے والے کو اس تناقض کا شعور ہی نہ ہو اور وہ پوری طرح اسلام سے واقف ہو اور نہ جمہوریت سے، بس زمانے کے چلتے ہوئے فیشن کے مطابق وہ بھی یہ اصطلاح اسی طرح لیکر چل پڑا ہو جس طرح فیشن بدلتے دیکھ کر لوگ بے سوچے سمجھے فیشن بدل لیا کرتے ہیں۔ ایسے نعرے لگانے والوں کے ہاں حقیقتاً اُن ساری باتوں کا امکان موجود رہتا ہے۔

اگر ہم دیکھیں تو گزشتہ دو تین صدی تک مسلمان ممالک پر مغربی ممالک اپنی قہرمانی قوت اور شوخ وشنگ تہذیب کے ساتھ حکمران رہے ہیں جس کے بارے میں اقبال نے فرمایا ہے، "چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر"۔

جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر تلوار کے زور پر فاتحانہ مسلط ہو جاتی ہے تو مفتوح اور مغلوب قوم کے افراد اس کی تلوار ہی سے مفتوح نہیں ہوتے بلکہ اس کے نظریات' اس کے علوم اور اس کے فلسفہ حیات تک سے مفتوح ہو جاتے ہیں اور کم ہی ایسے سخت جان ہوتے ہیں جو غالب قوم کے علوم وفنون اور تہذیب کی کٹھالی میں پگھلنے اور اس کا سانچہ اختیار کرنے سے بچ جاتے ہیں۔ جس طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مغلوبانہ ومرعوبانہ تغیر وتبدل شروع ہو جاتا ہے اسی طرح سیاسی برتری ختم ہونے کے بعد مدت تک یہ مرعوبانہ اور مغلوبانہ طرزِ فکر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور چونکہ فاتح قوم کے راج دربار میں مغلوب ومفتوح قوم کے صرف وہی افراد باریاب ہو سکتے ہیں جو اس کے رنگ وبو کو اختیار کر کے اس کے سانچے میں ڈھل جائیں اور اپنی وفاداری اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیں' تب یہ بدیشی آقا اپنے اختیارات ایسے ہی لوگوں میں منتقل کر کے انہیں اپنا حقیقی جانشین بنا کر جاتے ہیں۔

تمام مسلمان ملکوں میں جہاں ایک مدت کے بعد مغربی قوموں کی واپسی کے سبب سیاسی آزادی درآمد ہوئی ہے وہاں فطری طور پر خود بخود ایسے لوگ برسر اقتدار آئے ہیں جو پہلے سے فرنگیت کے بہت قریب تھے اس لئے مشرقِ وسطیٰ سے لیکر مشرقِ بعید تک بیشتر مسلمان ممالک میں وہی لوگ مسلط ہیں جو مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے اور اپنی زندگی کے شب وروز سے مغرب کے مقابلے میں اپنی مرعوبانہ طرزِ عمل اور طرزِ فکر کا پیہم انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ مشکل ہی سے یہ سوچ سکتے ہیں کہ یورپ سے آئی ہوئی کوئی چیز بھی ناقص ہو سکتی ہے چاہے وہ دین وایمان کا تصور ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی حیثیت مرغِ باد نما کی سی ہوتی ہے کہ جدھر کی ہوا چلی اسی طرف رخ موڑ لیا۔ اگر یورپین مسلط ہو جائیں تو سر سے پیر تک مغربی لباس میں نظر آئیں گے اور اگر حبشیوں کی حکومت قائم ہو جائے تو رنگ سیاہ ناک چپٹی اور بال گھونگھریالے کرنے کے طریقے استعمال کرنے لگیں گے اور اگر ہندوؤں کی برتری دکھائی دے تو سر سے پاؤں تک گاندھی بھگت نظر آئیں گے۔

ایسے لوگوں کے اپنے کوئی نظریات نہیں ہوتے صرف فاتح کے نظریہ حیات کا مشروب ان کے شیشۂ حیات میں رنگ بھرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔انہیں اسلام پر اعتماد نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس کا مطالعہ کر کے اس میں کچھ خامیاں 'کمزوریاں اور نقائص پائے ہوتے ہیں بلکہ ملی کردار نہ ہونے کے سبب ایک مفتوح قوم کا دین سمجھتے ہوئے خود بخود ان کا نقطۂ نظر اس کے بارے میں حقارت آمیز نہیں تو معذرت آمیز ضرور ہو جاتا ہے۔ان کیلئے ڈارون 'آئن اسٹائن اور نیوٹن کی بات زیادہ سائنٹیفک اور وزنی ہوتی ہے اور حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کی بات بے وزن ہوتی ہے۔انہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ دونوں گروہ دو مختلف علوم کے نمائندے ہیں، جن علوم پر موخر الذکر حضرات گہری نگاہ رکھتے ہیں ان کی ابتداء سے بھی اوّل الذکر لوگ نابلد ہیں لیکن ہر مسئلے پر سند ان کیلئے بہر حال اوّل الذکر حضرات ہی ہوتے ہیں۔اسلام کے بارے میں ان کا تصور چند عبادات کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا جو ان کی رائے میں ایک مصروف اور دنیادار آدمی کیلئے خارج از بحث اور از کار رفتہ معمولات ہیں۔ اسلام کی طرف سے اس بے اعتنائی اور محدود تصور کے بعد جمہوریت کے بارے بھی ان کا کوئی عملی تجرباتی اعتقاد نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی افادیت نے ان کو متاثر کیا ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا نعرہ اپنے چاروں طرف لگتا ہوا سنتے ہیں، مغربی قوموں میں اس موضوع پر لٹریچر تیار ہوتا ہے اور وہاں کی سیاسی جماعتوں کو اس قسم کے نعرے لگاتے ہوئے دیکھتے ہیں اس لئے ترقی پسند کی علامت، جدیدیت کا تقاضہ اور عصری تقاضوں کا لازمی جواب سمجھ کر اسے فیشن کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور اپنی سیاسی بولی میں بھی شامل کر لیتے ہیں ۔یہ ان کیلئے گویا کوئی عمرانی تصور نہیں ہوتا جو اپنے کچھ تقاضے رکھتا ہو بلکہ ایک پالیسی کا مسئلہ ہوتا ہے جو ہوا کا رخ دیکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔یہ پہلو ایک مرعوب ذہن اور ذہنی افلاس کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اب آپ خود ہی سوچیں کہ آخر اسلام اور جمہوریت میں کوئی قدر مشترک بھی ہے جس کی بناء پر ہم لوگ ان دو متضاد نظریات کا باہمی جوڑ لگانے اور دنیا بھر کے سامنے اپنی مزعومہ ترقی پسندی اور حقیقتاً اپنی کم علمی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟ مغربی حکومتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اس میں اقتدار کا سرچشمۂ عوام ہوتے ہیں اور وہ اپنے اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعے بروئے کار لاتے ہیں، ان نمائندگان کی اکثریت کے فیصلے یعنی وہ آئین یا قوانین ہیں جنہیں وہ خود وضع کریں اور وہ حرفِ آخر ہوتے ہیں۔عوام کے یہ نمائندے مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور جو پارٹی اکثریت میں ہوتی ہے وہ سیاہ و سفید کے مالک بن جاتی ہے۔ بہر حال ایسی نظامِ حکومت یعنی مغربی جمہوریت میں حکومت یا اقتدار ہر صورت انسانوں کے ہاتھوں میں رہتا ہے اور انہیں دوسروں پر حکومت کرنے کیلئے اکثریت کی بناء پر ہر قسم کا قانون بنانے کا مکمل اختیار ہوتا ہے اس کے برعکس اسلام یعنی قرآنی نظام میں حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں بلکہ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے (سورۃ یوسف۔۴۰)۔

"وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا"۔(سورۃ کہف۔۲۶)۔

حقِ حکومت کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مغربی جمہوریت یا آجکل کی اصطلاح میں "اسلامی

جمہوریت "قرآنی نظام کی ضد ہے۔ مغربی جمہوریت میں پارٹی سازی کی اجازت ہے لیکن پارٹی سازی کا قرآن کریم کی رو سے کوئی جواز نہیں۔

قرآن کریم کے مطابق نوعِ انسانی صرف دو گروہوں میں تقسیم ہے جن میں ایک گروہ کفار کا اور دوسرا گروہ مومنین کا ہے (سورۃ تغابن۔ ۳)۔

"یہ لوگ رسالتِ محمدیہ ﷺ پر ایمان لا کر حلقہ مومنین میں شامل ہوئے ہیں، انہیں اسلام نے ایک امت قرار دیا ہے" سورۃ البقرہ ۱۴۳۔

"بعدازاں انہیں آپس میں تفرقہ پیدا کرنے یعنی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ جانے سے منع فرمادیا ہے"۔ سورۃ آل عمران۔ ۱۰۳ نیز مغربی جمہوریت میں عوام اقتدار اکثریتی پارٹی کے نمائندگان کو تفویض کرتے ہیں لیکن اسلام میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور وہ اپنا اقتدار کسی نمائندہ کو تفویض نہیں کرتا۔ چنانچہ اس حقیقت کی وضاحت کیلئے خود زبان نبوی سے کہلایا گیا کہ: کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب اور جستجو کروں حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے" (سورۃ انعام ۱۵)۔

اس مقام پر واضح ہو جاتا ہے کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو پھر خدا کی حکومت کیلئے انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل ہو جاتا ہے۔

مزید وضاحت کیلئے ان سادہ مثالوں پر آپ ذرا غور فرمائیں تو بات اور کھل کر سامنے آجائے گی کہ اسلام ایک خدا کی حاکمیت کا قائل ہے جب کہ جمہوریت کا بنیادی فلسفہ اکثریت کی جماعت کی حکمرانی ہے۔ اسلام رسالت کے ذریعے ہدائت الٰہی کا علمبردار ہے، جمہوریت ہدائت الٰہی کے فلسفے کو سرے سے تسلیم نہیں کرتی بلکہ ہر قسم کی قانون سازی اور اس کے نفاذ کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک دعویٰ، جوابِ دعویٰ کے ٹکراؤ سے جو نتیجہ در آمد ہوتا ہے بس وہی نسخہ ہدائت ہے جو زمانے کے ساتھ پیہم بدلنے والی چیز ہے۔

اسلام آخرت میں خدا کے سامنے دنیا و اعمال کی جوابدہی پر اپنے سارے نظام فکر کی بنیاد رکھتا ہے، جمہوریت سرے سے آخرت، جزا و سزا، جنت و دوزخ کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اسلام تمام انسانوں کو بنی آدم کی اولاد کی حیثیت سے مساوی اور بھائی بھائی قرار دیتا ہے جبکہ جمہوریت انسانیت کو کئی طبقوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف لڑنے اور ختم کرنے پر ابھارتی ہے۔ انسان اخلاقی قدروں کو انسانی حسن کا لازمی جزو قرار دیتا ہے لیکن جمہوریت اخلاق کو اضافی اور قابل ترمیم و اضافی چیز سمجھتی ہے۔ اسلام معاشرے میں مرد و اور خاندان کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، جمہوریت انہیں تحلیل کر کے ایک ریاستی معاشرے میں بالکل بکھیر دیتی ہے۔ الغرض یہ دو

الگ الگ طرزِ حیات ہیں اور ان میں باہمی بنیادی طور پر کوئی بھی قدر مشترک نہیں کہ ان میں باہمی جوڑ لگایا جا سکے۔

اس کھلی ہوئی متناقض اصطلاح کو اختیار کرنے اور الحاد کے ساتھ ایمان کا جوڑ لگانے کی ایک مجبوری ان حضرات کیلئے کچھ مقامی حالات بھی ہوتے ہیں۔ جن قوموں میں انہیں اقتدار پر قبضہ کرنا ہوتا ہے ان کے عوام اپنے دین و مذہب سے جذباتی لگاؤ اور تعلق رکھتے ہیں۔ یہ وہی مجبوری ہے جو ایک مسلمان قومی لیڈر کو لاحق ہوئی تھی تو اس نے اپنی بے پردہ بیگم سے کہا تھا کہ ہمیں جس علاقے کا دورہ کرنا ہے وہاں تمہیں برقعہ اوڑھنا پڑے گا اور جب بیگم نے اپنی روایتی بے پردگی کے سبب یہ رجعت پسندی اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے دباؤ ڈالتے ہوئے صاف کہہ دیا تھا کہ "یہ تمہیں بہر صورت کرنا پڑے گا کیونکہ وہاں کے لوگ بہت متشدد مذہبی ہیں"۔ گویا خدا اور رسول کا حکم یا اسلامی شعار اس وقتی پردے کا باعث نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی ضرورت تھی جو بہر حال وقتی طور پر مقامی حالات کے مطابق پوری ہونی چاہئے تھی۔

ایسے لوگ نہ تو اسلام کا حقیقی علم رکھتے ہیں، نہ اسے ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے دیکھتے اور تسلیم کرتے ہیں اور نہ ان کے خیال میں اسلام دنیا کے مسائل کا کوئی حل پیش کرتا ہے، اس لئے زمانے کی چلتی ہوئی کسی بولی کا پیوند اسلام کے ساتھ لگا کر وہ اپنی قوم کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں اور زمانے کی ہوا کے رخ پر بھی اڑنا چاہتے ہیں تاکہ کوئی انہیں قدامت پسند اور "جامد ملا" خیال نہ کرے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے اگر زمانے میں آمریت کا رواج ہو جائے تو اسلام کے اندر سے خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ اولیاء الامر کی اطاعت کے وجوب کی دفعہ نکال کر سامنے رکھ دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سارا اسلام آمریت ہے اور خلفاء راشدین بھی تمام آمر تھے اور اگر زمانے میں اشتراکیت کا غلبہ ہو جائے تو یہ بھی حضرت ابوذر غفاری کے تقویٰ و بے نفسی کی مثال سامنے لا کر مالی مساوات اور "ارض اللہ" کا ٹکرا پیش کر کے قومی ملکیت کا تصور سامنے رکھ دیتے ہیں کہ دیکھو اسلام تو سراسر اشتراکیت ہی ہے اور اگر اشتراکیت میں تھوڑا سا خوفِ خدا شامل کر دیا جائے تو بالکل خالص اسلام بن جاتا ہے۔ اگر سوشلزم کی بات چل پڑے تو اسلام کی رفاہی عوامی خدمات کی کچھ مثالیں سامنے رکھ کر اسلام کو جدید سوشلزم کا قدیم ایڈیشن ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر بس ذرا سی نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اگر جمہوریت کا چرچا ہو تو مساوات انسانی اور خلفاء پر تنقید کی مثالیں بتا کر اسے مغربی جمہوریت کا مکمل چربہ ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ پوزیشن بالکل ویسی ہے جو سپٹنک کے فضائی خلا میں اڑنے پر ہندوستان کے برہمنوں نے کوئی وید دکھا کر اختیار کی تھی کہ وید میں سپٹنک کا ثبوت موجود ہے جہاں جنگ مہابھارت میں بھیم کے ہاتھ سے پھینکے ہوئے ہاتھی کا ذکر موجود ہے جو اتنی بلندی پر گیا کہ خلاء میں جا داخل ہوا اور اب تک خلاء میں پرواز کر رہا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظام زندگی ہے اور بس اس کا آخری ایڈیشن لانے والے وہ آخری نبی ﷺ ہیں جو اسے تمام انسانی ضرورتوں کیلئے آخری نسخہ کیمیا اور نظامِ زندگی کے طور پر لائے ہیں۔ یہ نظام تمام عصری تقاضوں کو نہ صرف پورا کرنے والا بلکہ انسان کی تمام مشکلات اور الجھنوں کو رفع کرنے والا ہے۔ آج انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ قومی کشمکش اور بین الاقوامی جنگیں ہیں جو اسے

تباہی کے کنارے کی طرف لیجارہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ناتمام اور ناقص نسخے بلکہ ٹوٹکے جو مغربی تہذیب زخم خوردہ انسانوں کیلئے تجویز کررہی ہے ان میں ہر نسخہ پہلے سے بڑھ کر تباہی پھیلانے والا ثابت ہوا ہے۔ سرمایہ داری کا علاج بن کر اشتراکیت آئی لیکن وہ اس سے بڑھ کر انسانونں کو غارت کرکے اپنے ہی گھر کے دامن میں نیست ونابود ہوگئی۔

آج دنیا بھر میں انسان مغربی تہذیب اور اس کے عطائی نسخوں سے ہلاکت کے بستر پر پڑا ہوا ہے اور اس انتظار میں ہے کہ کب کوئی ہائیڈروجن بم یا ایٹم بم پھٹ کر انسانیت کو مکمل تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔ سوشلزم تو دنیا کے دو عظیم فتنوں میں سے ایک فتنہ ثابت ہو کر اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرچکا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل کوئی سوشلزم کی ایسی المناک موت کے بارے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن پھر بھی اسلام کے علمبرداروں نے اس کی پیش گوئی کردی تھی کہ "سوشلزم کو ماسکو میں اور سرمایہ دار جمہوریت کو لندن پیرس اور نیویارک میں پناہ نہیں ملے گی۔" دنیا نے دیکھ لیا کہ ایک فتنہ اپنے انجام کو پہنچ گیا اب جلد یا بدیر دوسرے فتنے کی باری ہے اور اس وقت تمام مصائب کے مداوا کیلئے اسلام ہی آخری پناہ گاہ ہوگا کیونکہ اسلام ہی اپنی ذات میں مکمل جامع خود کفیل اور ساری انسانی مشکلات کا واحد حل ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں، آزمودہ طرزِ حیات ہے جس نے اپنے اصولوں پر خالص معیاری انداز میں ایک طویل عرصے تک ایک خالص اسلامی ریاست چلا کر دکھائی جو دنیا کیلئے زمین پر خدا کی سب سے بڑی رحمت تھی اور پھر معمولی دستوری تغیر کے ساتھ مدت دراز تک ایسی حکومتیں چلائی ہیں جن میں افلاس کی کوتاہیوں کے باوجود جرم وافلاس 'ظلم وزیادتی کی کم سے کم مثالیں ملتی ہیں اور ان کا مقابلہ آج کا مہذب اور ترقی یافتہ دور بھی بالکل نہیں کرسکتا۔ ان کی عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار ایسی نہ تھی۔ مجرم خود اعتراف کرتے اور حکمران تک عدالت کے کٹہرے میں طلب کرلئے جاتے تھے۔ ان کے معاشرے میں بھوکے ننگے لوگوں کے لشکر چیونٹیوں کی طرح بازاروں میں چلتے اور ہر شخص سے چمٹے نظر نہ آتے تھے جیسے دور جدید کے تقاضوں نے پیدا کردیئے ہیں۔ ان کے ہاں اشیاء صرف کی قیمتیں نہائت کم تھیں جب کہ اس ترقی یافتہ دور میں بنیادی ضروریات بھی وصال صنم کا درجہ اختیار کرگئیں ہیں۔

دراصل یہی وہ نظام زندگی ہے جس کا علمبردار بن کر مسلمان ملکوں کے سربراہوں کو اٹھنا چاہئے تھا۔ جس چیز کی دنیا کو تلاش اور طلب ہے وہ اسلام کے اندر مکمل طور پر موجود ہے اور شائد ہی کسی دور میں انسانیت اسلام کے اصولوں کیلئے اتنی پیاسی اور حاجت مند تھی جتنی آج ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مشرق ومغرب کی ساری مرعوبتیں چھوڑ کر اسلام کو ایک نظامِ حیات اور نظریہ زندگی لیکر اٹھتے، پہلے خود اس پر عمل کرتے اور پھر ساری دنیا کو اس کی دعوت دیتے کہ ہمارے سارے دکھوں کا علاج صرف اسلام میں ہے۔ ہمیں بین الاقوامی برادری کی اگر ضرورت ہے تو یہ بھی صرف اسلام عطا کرسکتا ہے اور اپنے دور عروج میں جب اس پر عمل کیا گیا تو مراکش سے لیکر چین تک اس کی عملاً تصویر دیکھنے کو ملی۔

ان جدید نظریات اور مغربی جمہوریت نے ہمیں رنگ وبو، نسل وقبیلہ کے چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہمیں

اس وقت محبت واخوت کی ضرورت ہے اور یہ صرف اسلام ہی ہے جو رنگ ونسل وقبیلہ کے امتیاز کو مٹا کر ہم کو بنی آدم کی حیثیت سے بھائی بھائی اور خدا کے مساوی بندے قرار دیتا ہے اور تمام علاقائی عصبیتوں سے نجات دلاتا ہے۔آج ساری دنیا بداخلاقی کے ریلے، فحاشی کے چکر، نئی نسلوں کی تباہی اور نئی نئی جنگوں کی یورش سے پریشان ہے۔اسلام ہمیں اخلاق فاضلہ سکھاتا ہے،انصاف و عدل کی تعلیم دیتا ہے'بین الاقوامی نظریاتی بیداری پیدا کر کے جنگوں کا سلسلہ ختم کر دیتا ہے۔

اب افسوس اس بات کا ہے کہ جاں بلب دنیا کا تریاق "اسلامی نظام" کی صورت میں ہمارے پاس ہے اور ہم اسے پسِ پشت ڈال کر دنیا سے زہریلے ٹوٹکے لیکر انہیں ان کے تریاق "مغربی جمہوریت" کے ساتھ ملا کر بڑے فخر کیساتھ سر اونچا کر کے کہتے ہیں کہ ہم بھی اسلامی جمہوریت کے قائل، ترقی پسند، جدید اور عصری تقاضوں کو سمجھنے والے لوگ ہیں۔اس سے زیادہ کور بصری اور نظریاتی تہی دامنی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں ایسے عطائی طبیبوں سے جلد نجات عطا فرمائے۔آمین!

# عیدالفطر اور عید کارڈ

عیدالفطر کے موقع پر یقینا مختلف احباب ایک دوسرے کو تہنیتی پیغامات بذریعہ عید کارڈ ارسال کر رہے ہیں اور بعض حضرات جدید دور کی ٹیکنالوجی کو استعمال کرتے ہوئے موبائل فونز سے ایس ایم ایس کی سہولت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف انداز میں پیغامات وصول کر رہے ہونگے۔ یقینا  قارئین کی بڑی تعداد ان مغربی ممالک ہیں عید کارڈ کو بھی کرسمس کارڈ کے مقابلے میں اپنے گھروں میں نمایاں جگہ دیکر بچوں کو اپنے اس اسلامی تہوار سے متعارف کروانے کی کوشش ناتمام کرتی ہے حالانکہ مسلمان ان رسوم و قیود سے بالکل بے نیاز ہے۔ وہ تو بہت بے تکلف اور سادہ زندگی گزارنے کا عادی ہے۔ ہر تہوار کے پس منظر میں جو پیغام ہوتا ہے اس کو نظرانداز کر کے ہم نے جس طرح مغربی ماحول کی نسبت سے اپنے ہر تہوار کو ڈھال لیا ہے، چند مغربی رسوم کو کلمہ پڑھا کر تیزی سے ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اپنے آپ کو اجتماعی ذمہ داریوں سے دور کر رہے ہیں، یقینا مستقبل کا مؤرخ ہمیں اس سلسلے میں معاف نہیں کرے گا۔

آجکل عیدالفطر کے موقع پر جس تیزی کے ساتھ عید کارڈ کا اپنے احباب کے ساتھ تبادلہ کر رہے ہیں  ان پر اٹھنے والی بھاری رقم کئی مفلس گھروں میں  یقینا عید کی خوشیاں لاسکتی ہے جو اپنے عزیزوں کو کاغذ و گلدستے پیش کرنے پر اٹھ رہی ہے حالانکہ خطوط میں لکھے ہوئے الفاظ ہیں بھی خلوص و محبت کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے اور پھر ان کانٹوں بھری زندگی کو جو ایک غلط نظامِ حکومت کے تحت گزارنی پڑ رہی ہے۔ اس میں خلوص و محبت اور وفا کے پھول یقینا بڑی چیز ہیں اور اس زندگی کی مسافت آدمی بتدریج طے کر کے جب کچھ شعور حاصل کرتا ہے تو اس کو آگہی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں سکون دینے والی چیزوں میں مقید زندگی کا شعور اور بے غرض مہر و محبت بڑی چیز ہے۔ مقید زندگی کا شعور انسان کو غم و آلام سے نجات دلا کر اطمینان سے بھر دیتا ہے۔

آدمی خالی ڈھول کی مانند نہیں رہ جاتا کہ معمولی ٹھوکر سے واویلا کرنے لگے بلکہ ایک ٹھوس وجود بن جاتا ہے جسے حوادث کی آندھیاں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں اور مہر و محبت وہ قوت ہوتی ہے کہ جو صرف اپنے ہم مقصد ساتھیوں کی رفاقت سے حاصل ہوتی ہے ۔ساتھیوں کی باتیں، ان کے مصافحے، ان کے معانقے، ان کی محبت بھری گفتگوئیں، ان کی بے غرض دوستیاں اور بے لوث ملاقاتیں ان سب چیزوں کے درمیان آدمی اپنے آپ کو ایک لشکر کے درمیان سمجھتا ہے۔ پرامن اور پرسکون عزیز دوست اس مختصر سی زندگی میں متاع بے بہا ہے جب کہ اس ملک میں مشینی انداز میں کام کرتے کرتے اعضاء اس قدر بے جان ہو گئے ہیں کہ ہمیں صرف ایک کارڈ میں اس قدر جان معلوم ہوتی ہے کہ اس کو خود سے توانا سمجھ کر اس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

ویسے عید کارڈ ماہِ رمضان کی جدائی کا پیغام لیکر آتا ہے، اس جملے میں کسی تقویٰ کا اظہار کرنا مقصود ہرگز نہیں، اس ماحول میں تو اب ایسے

ایسے اصحاب دیکھنے کو مل رہے ہیں جن کے تقدس کی خود صاحب تقویٰ قسمیں کھاتے ہیں لیکن جب ان کو غور سے دیکھیں تو ان کی حیثیت کسی میلے میں بکنے والے رنگین غباروں سے زیادہ نہیں ہوتی جو اوپر سے بڑے رنگیں اور خیر وخوبی کے مدعی ہوتے ہیں لیکن اندر سے حرص وہوس کی متعفن ہوا نکل رہی ہوتی ہے اور جب زندگی میں تند ہوا کا جھونکا ان کی قلعی کھول کر رکھ دیتا ہے تو پھٹ کر ایک چھیچھڑے کی طرح ایک کونے میں جا گرتا ہے اور بالآخر پاؤں میں مسل کر باہر کسی کوڑے کرکٹ یا گندگی کے ڈبے میں اس کو جگہ ملتی ہے۔ اللہ ہر مسلمان کو اس تقویٰ سے محفوظ رکھے آمین! اور ایسے تقوے کی توفیق عطا فرمائے جو ہوائے نفس سے خالی ہو، جو مظاہر نمود ونمائش اور ادعا سے پاک ہو، جس میں اتنی ہمت ہو کہ حق کی راستے میں مشکیں کسی جائیں اور الٹا اونٹ سے باندھ کر مدینے کی گلیوں میں گھسیٹا جائے تو بھی اٹھ کر صاف صاف یہی کہے کہ "لوگو! سن لو میں مالک بن انس ہوں، میں کہتا ہوں کہ جبر یہ طلاق شریعت میں وارد نہیں ہوتی، جس میں اتنی ہمت ہو کہ جب اس پر کوڑوں کی بارش ہو تب بھی یہ بات کہے کہ اپنی بات منوانے کیلئے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل لاؤ، جس میں اتنا حوصلہ ہو کہ جیل میں موت قبول کرلے اور زنداں سے اس کا جنازہ نکلے (امام ابو حنیفہ) جس میں اتنی جرأت ہو کہ پھانسی کے تختہ پر بھی مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر چڑھ جائے کہ الٰہی تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے شہادت کی موت نصیب فرمائی، نہ کہ چند مظاہر لباس وتراش کا نام تقویٰ رکھ کر اس کا اعلان کرکے تقویٰ وپرہیز گاری کا اشتہار پیش کیا جائے۔ یہ طریقہ اب تک تو چلا ہے انشاء اللہ کل نہ چلے گا۔

ایک صاحبِ نظر نے سچ کہا تھا کہ پہلے ایمان کو اپنے اندر مستحکم کرو پھر اس پر عمل کرکے اور ساری زندگی اطاعتِ رب میں دیکر اپنے اسلام کا ثبوت پیش کرو، ساری زندگی کا لمحہ بہ لمحہ محاسبہ کرتے ہوئے چلو، کسی موڑ پر ٹھوکر نہ کھاتے اور ہمہ تن اپنے فرائضِ بندگی کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہوئے تقویٰ پیدا کرو اور پھر اپنا سب کچھ اپنے مالک کی راہ میں لگاؤ اور اس راہِ حق کے غبار بن کر احسان کا مقام حاصل کرو لیکن یہاں تو ثابت ذرا بھی اسلام نہیں لیکن لباس تقویٰ کا زیبِ تن کیا ہوا ہے۔ منبر رسول پر کھڑے ہو کر لوگوں کو سود (مارگیج) سے منع کیا جارہا ہے لیکن خود بینک میں سودی اکاؤنٹ رکھ کر بینک سے صد فیصد قرض لیکر مکان خرید اجارہا ہے، کاروبار میں وسعت کی جارہی ہے اور پوچھنے پر محاسبہ سے بچنے کیلئے مغرب یا امریکا کو "دار لحرب" کا نام دیکر جان بخشی کا بہانہ ڈھونڈا جارہا ہے۔ سود جسے قرآن میں بڑی صراحت کے ساتھ اللہ اور رسول کے خلاف کھلی جنگ قرار دیا گیا ہے اسی کے سہارے اسلامی شعائر کا مذاق اڑا کر داعی حق کا گراں بار فریضہ بھی سرانجام ادا کیا جارہا ہے۔

جس کارڈ سے عید کی خوشی کا پیغام دینا مقصود ہوتا ہے اسی کارڈ کو دیکھ کر بچے حیران وپریشاں ہیں کہ آخر ہم مسلمانوں کی عید ایک دن کیوں نہیں منائی جاتی؟ کیا وجہ ہے کہ چاند کچھ مسلمانوں کو سعودی عرب میں نظر آتا ہے تو کچھ مراکش کے بادلوں میں اس کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں؟ ہم سارا سال اپنی نمازوں کا تعین یہاں برطانوی محکمہ موسمیات کے بتائے ہوئے اوقات سے ترتیب دیتے ہیں لیکن چاند کے بارے میں ان کی سائنسی گواہی ماننے کو تیار نہیں؟ عید جو اتفاق ومحبت کا پیغام لیکر آتی ہے آخر اس کے نام پر کیوں دنگا

فساد کیا جاتا ہے حالانکہ رمضان کا چاند طلوع ہوتے ہی اس گئی گزری مسلمان قوم کے اندر بھی زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ۔ایک اضطراب، ایک احتیاط، ایک خدا خوفی، ایک ذوقِ عبادت ابھر کر سامنے اس طرح آجاتا ہے جس طرح صبح کی شمع سنبھالا دیتی ہے اور محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ قوم واقعی دوسری اقوام سے مختلف ہے۔

بس یہی ایک مہینہ ہے جب اس قوم کے اندر ایک امتیازی نشان ابھرتا ہے، ان کے دل خوف خدا سے لبریز صدقہ و خیرات، غم گساری اور بھائی چارے کے علاوہ شب بیداری و عبادات میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن اس مہینے کے آخری دن اور پھر سارا سال یہ شناخت کرنا مشکل ہے کہ یہ لوگ کس ملت سے تعلق رکھتے ہیں ۔روزوں کی احتیاط میں نماز تراویح کیلئے مساجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی، سحری کی رونق، افطاری کی چہل پہل، یہ امتیازات اس قوم کو دوسروں سے ممتاز کر دیتے ہیں، یہی وہ برکات ہیں جو اس مہینہ کو سال بھر میں عزیز تر مہینہ بنا دیتی ہیں، اب تو انہی کے دم قدم سے کچھ نشان، امتیاز قائم ہے لیکن جونہی مغرب اور غیر مسلموں کی نقالی کر کے عید کارڈ ارسال کرتے ہیں تو گویا خود فراموشی کے بقیہ گیارہ مہینوں کا پیغام دیتے ہیں جو اس متنازعہ دن کے بعد شروع ہونے والے ہیں۔اس لئے رمضان المبارک کی مفارقت اور آئندہ گیارہ مہینوں کی منافقت آنکھوں میں نم آلود غبار پیدا کر دیتی ہے۔اگر سچ پوچھیں تو عید کیا ہے جسکے ہم مسلمان منتظر ہیں؛

عید آزاداں شکوہ ملک ودیں
عید محکوماں ہجومِ مومنین

شکوہ مومنین تو بڑی چیز ہے، شکوہ ملک ہی سے محروم ہیں۔ شکوہ ملک جس چیز کا نام ہے وہ ہر قسم کے خارجی وداخلی اثرات سے آزاد اور پاک ملکی پالیسی ہے۔داخلی اطمینان اور سرحدوں کی قوت و شوکت ہے، دوسرے ممالک میں عزت و منزلت کا مقام ہے، قوموں کی برادری میں سربلندی ہے، افرادِ قوم کا اطمینان معاشی و معاشرتی خوشحالی ہے لیکن خوردبین لگا کر بھی آپ کو یہ اوصاف کسی مسلمان ممالک میں نہیں ملتے بلکہ مسلمان مملکتیں اپنے اندر کئی گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے گلے کاٹنے میں مصروف ہیں اور اغیار اس بات پر خوش ہیں کہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر وہ ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اگر دنیاوی دولت سے اللہ نے کچھ اسلامی ممالک کو مالا مال فرمایا ہے تو ان کی دولت سے فائدہ بھی اغیار اٹھا رہے ہیں، ان مسلمانوں کے خزائن اغیار کے تصرف میں ہیں اور اسی سرمائے سے مسلمان ممالک کو اسلحہ تیار کر کے فروخت محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس کا تجربہ بھی تم دوسرے مسلمان ممالک کی آبادی پر

کرو۔

پھر شکوۂ دیں یہ ہے کہ اللہ جس کے حاکم ہونے کا اقرار ہمارے ہاں کلمہ پڑھ کر ایک جاگیر دار و سرمایہ دار سے ہاری و مزدور تک کرتا ہے تاکہ اسی کا حکم اور قانون چلے اور جس کو آقا مانا ہے اس سے انحراف نہ ہو۔ یہ عجیب مذاق ہے کہ ایک نمبردار ہے تو گاؤں کا ہر فرد اسے تسلیم بھی کرے اور اس کے حقوقِ نمبرداری ادا بھی کرے، ایک شخص ضلع افسر ہے تو ضلع بھر میں اس کی افسری کا ڈنکا بھی بجے اور کوئی شخص ملک کا سربراہ ہو تو اس کا ہر لفظ سر آنکھوں پر ہو اور جو خود کہتا ہے کہ (انا الحکم اللہ) اسی کے حکم کی ذرہ بھر پرواہ نہ ہو۔

ادھر ہر طرف دین کے نشانات مٹ رہے ہوں ادھر رقص و سرور کی مجالس سج رہی ہوں، گانا بجانا کلچر کے نام پر روا ہو، پینے پلانے کی کھلی اجازت ہو، چوری چکاری، بدعنوانی، رشوت خوری موجود ہو، رزقِ حلال کا حصول ناممکن کر دیا ہو، جو بچا کھچا دین قوم میں صدیوں کے انحطاط کے باوجود باقی چلا آرہا ہو اس کا بھی صفایا کیا جارہا ہو، قوم بار بار پکارے کہ ہمیں دین کی حکمرانی اور اسلام کا قانون چاہئے، اسی کے خلاف ساری قوت اور طاقت استعمال ہو رہی ہو اور دین سے ہر قدم دور جارہا ہو، برسوں کا سفر زندگی مکہ مدینہ کی سمت چھوڑ کر کسی اور ہی سمت کیا گیا ہو تو وہاں شکوۂ دین کہاں سے آئے گا، پھر جب نہ شکوہ ملک ہو نہ شکوۂ دین تو پھر آزاد بندۂ مومن کہاں ملے گا اور یہی وجہ ہے کہ عید کا دن ہجومِ مومنین کے سوا کچھ نہیں، اس لئے عید کی خوشی کا اظہار ایک کارڈ کی ترسیل میں وقت ضائع کرنے کو سوا کچھ نہیں۔

ہاں البتہ اگر عید کی حقیقی خوشیوں کا حصول چاہتے ہیں تو یہ بہترین موقع ہے کہ وہ ہزاروں سفید پوش خاندان جو اس وقت غربت اور فاقہ کشی کی حالت میں کسی سے بھی اپنا یہ دکھ بیان نہیں کر سکتے اور غیر انسانی حقوق کی پابندیوں کے وجہ سے دوسرے ملک کے افراد بھی ان تک امداد پہنچانے سے قاصر ہیں، آپ کی فوری توجہ کے مستحق ہیں۔ جلدی کیجئے کہیں دیر نہ ہو جائے۔

# شہادت وخلافت

اسلامی سال کا آغاز ماہ محرم الحرام سے ہوتا ہے۔امم سابقہ میں بھی اس کو ماہ معظم سمجھا جاتا تھا اور آج بھی ماہِ محرم کی عظمتوں سے کسی کو انکار نہیں اور خصوصاً یوم عاشورہ محرم کی دس تاریخ تو ملت اسلامیہ کا ناقابل فراموش دن ہے۔ گو اس کی وجہ تسمیہ میں علماء کا اختلاف ہے اور اس کی وہ مختلف توجیہات بھی بیان فرماتے ہیں۔ بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے جو بزرگیاں دنوں کے اعتبار سے امت محمدﷺ کو عطا کی ہیں اس میں یہ دن دسویں بزرگی کا ہے اور بعض کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب انبیاء پر مختلف انعامات اسی دن فرمائے! اس حدیث سے یومِ عاشورہ کی اہمیت قدرے واضح ہو جاتی ہے کہ:

سیدنا ابی عباسؓ رسول اکرمﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عاشورہ کے دن آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کو پیدا فرمایا' حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق بھی اسی دن فرمائی' حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ بھی اسی دن باریاب ہوئی' اسی دن ان کو جنت میں داخل فرمایا گیا۔ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ بھی اسی دن پیدا ہوئے' اور ان کے بیٹے کا فدیہ قربانی بھی عاشورہ کے دن دیا گیا۔ فرعون کو بھی اسی دن دریائے نیل میں غرق کیا گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف بھی اسی دن دور فرمائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی لغزش بھی یوم عاشور کو معاف فرمائی گئی اور حضرت عیسیٰ علیہ لسلام ابن مریم کی ولادت بھی اسی دن ہوئی اور قیامت بھی یوم عاشورہ کے دن ہی واقع ہو گی (غنیۃ الطالبین)

لیکن پاک وہند اور چند اسلامی ممالک میں محرم الحرام کی ان تمام عظمتوں کے علاوہ اس کی وجہ تسمیہ شہادتِ حسین بھی ہے بلکہ اس عظیم واقعہ کی چھاپ ہماری اسلامی تاریخ پر اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے علاوہ اب عملاً ہمارے لئے کسی اور واقعے کی اتنی اہمیت ہی نہیں رہی اور نہ ہی ہم اس سے واقف ہیں۔ شہادت حسینؓ حق کی ایسی تصویر کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس دن کی دوسری عظمتوں کا نہ تو ہم ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔

اسلام کی روح یہ ہے کہ وہ ناحق اور باطل کے سامنے سر کٹا دے لیکن ہرگز اس کو جھکنے نہ دے' اس عظیم عمل کو شہادت کہتے ہیں اور اس شہادت کی اعلیٰ ترین مثال اور تکمیل کا نام بلاشبہ "شہادتِ حسینؓ" ہے جنہوں نے چھ ہزار کے لشکر کے سامنے عام روایت کے مطابق بہتر (۷۲) مجاہدوں کے ساتھ ٹکر لی اور ان ظالم حکمرانوں کے سامنے سر جھکانے کی بجائے

لڑ کر اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ یہی وہ کردار ہے جس کی بناء پر ہم یوم عاشورہ کی یاد مناتے ہیں۔ لیکن تاریخ کے جھروکوں کو بغور دیکھیں تو ہمیں حضرت حسن اور حضرت حسین علیہم السلام دو مختلف قسم کے طریقہ کار کی علامت نظر آتے ہیں۔ ہمیں جہاں حضرت حسینؓ سیاسی طریقہ کار کے علمبردار نظر آتے ہیں وہاں حضرت حسن غیر سیاسی طریقہ کار کی حکمت کے مینار دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت حسینؓ نے حاکم وقت کے ساتھ جنگ کر کے جو سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی وہاں یہی مقاصد حضرت حسنؓ نے جنگ کے میدان سے واپسی کے ذریعے حاصل کیئے۔ اس اہم اور لطیف فرق کو سمجھنے کیلئے ہمیں تاریخ کی اس تصویر کے ہر پہلو کو بڑی ایمانداری سے دیکھنا ہوگا اور ان تاریخی واقعات کو سامنے رکھ کر ان عظمتوں کی مینارۂ ہدائت کو اپنی قوموں کی زندگی کیلئے مشعلِ راہ بنانا ہوگا۔

تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مکہ میں قدیم زمانے سے قریش کے دو خاندان بنو ہاشم اور بنو امیہ آباد تھے اور ان میں خاندانی رقابت بھی چلی آرہی تھی۔ لیکن جب بنو ہاشم کے ایک فرزند نے نبوت کا دعویٰ کیا تو مخالفت میں بنو امیہ سب سے آگے تھے۔ لیکن فتح مکہ (۸ھ) کے بعد عرب کے دوسرے قبائل کی طرح بنو امیہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے اور عہد رسالت میں اور خلافتِ راشدہ میں بنو امیہ کے لائق افراد نے مختلف اسلامی عہدے بھی حاصل کیئے جس کی ایک درخشاں مثال حضرت عثمانؓ ابی عفان ہیں۔ اس دور میں (۲۵ھ تا ۳۵ھ) میں بنو امیہ کا اثر و رسوخ تمام دوسرے قبائل سے کہیں زیادہ ہوگیا۔ اس کے بعد جب حضرت علیؓ ابن طالب کا انتخاب بطور امیر المومنین ہوا تو اس وقت بنو امیہ نے محض شہادت عثمانؓ کے مسئلہ کو بنیاد بنا کر پہلے ہاشمی خلیفہ کے خلاف پرانی رقابت کو از سر نو زندہ کر دیا جس کی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا پورا زمانہ خلافت (۳۵ھ تا ۴۰ھ) باہمی خانہ جنگیوں اور شورش میں گزرا، اور آخر اس کی انتہاء ایک جنونی عبدالرحمان ملجم کے ہاتھوں شہادت کے ذریعے ہوئی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد آپ کے لختِ جگر حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت ہوئی۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ صرف عراق اور خراسان کی خلافت امام حسنؓ کے حصے میں آئی جبکہ شام، فلسطین، یمن، حجاز اور مصر وغیرہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی کے زیر قبضہ تھے جنہوں نے خونِ عثمان کے مسئلے کی بناء پر حضرت علیؓ کی بیعت سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بھلا اب حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ کیسے تسلیم کر لیتے؟ ربیع الاول ۴۱ھ کو صورتحال اس نوبت کو آن پہنچی کہ امام حسنؓ کے ساتھ چالیس ہزار سے زائد مسلح افراد تھے اور دوسری طرف حضرت امیر معاویہ کے جھنڈے تلے ساٹھ ہزار کا لشکر مرنے مارنے کیلئے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ یہاں پر حضرت امام حسنؓ کا وہ تاریخی، غیر سیاسی کردار سامنے نظر

آتا ہے جس کے متعلق عام قاری تو کجا ہمارے دانشور اور علماء حضرات بھی بے خبر نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امام حسنؓ کا یہ عظیم کردار لوگوں کے سامنے ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آسکا جس طرح امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ ہے۔

حضرت حسنؓ نے اپنے والد کے پانچ سالہ خلافت کے پر آشوب زمانے میں مسلمانوں کو خود بھائیوں کی تلواروں سے ذبح ہوتے دیکھا تھا اس لئے باہمی خون خرابہ اور نہ ختم ہونے والے سلسلے کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کیلئے خود میدان سے ہٹ گئے اور خلافت کا عہدہ حضرت امیر معاویہؓ کے حوالے کر دیا اگرچہ حضرت حسنؓ حق پر تھے اور امت کے جائز خلیفہ تھے۔ اس کے بعد دو عشرے (۴۱ھ تا ۶۰ھ) تک حالات پر سکون رہے اور اسلامی سلطنت کی سرحدوں میں بھی خاصی توسیع ہوئی۔ امیر معاویہؓ کے انتقال (رجب ۶۰ھ) تک حالات بڑے پر سکون رہے لیکن جب خلافت کا مسئلہ دوبارہ کھڑا ہوا تو امام حسینؓ جو اپنے باپ کی شہادت اور بھائی کی خلافت سے دستبرداری سے خوش نہ تھے، انہوں نے یزید کی خلافت سے اسی طرح انکار کیا جس طرح اس سے پہلے حضرت معاویہؓ نے ان کے والد محترم حضرت علیؓ کی خلافت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہیں سے امام حسینؓ (۴ھ تا ۶۱ھ) کا وہ کردار شروع ہوتا ہے جس کی یاد اب یوم عاشورہ کو منائی جاتی ہے۔

عتبہ بن ابی سفیان نے جب مدینے میں یزید بن معاویہ کیلئے لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا تو امام حسین نے معذوری کا اظہار کر دیا اور خاموشی کے ساتھ اپنے اہل وعیال کو لیکر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ یہاں آپ کی آمد سے قبل مکہ کے لوگ عبداللہؓ بن زبیر پر بیعت کر چکے تھے اور یہ صورتحال حضرت حسینؓ کو قابل قبول نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حسینؓ اور آپ کے اہل خانہ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے جو عملاً اس وقت مکہ کے حاکم تھے۔ شہادت حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیلئے مکہ و مدینہ کے حالات سازگار نہیں تھے جس کی بناء پر اسلامی ریاست کا دارالخلافہ ۳۶ھ میں مدینہ سے کوفہ منتقل ہو گیا تھا۔ اس طرح امام حسنؓ نے بھی خلافت سے دستبرداری کے بعد ۴۱ھ میں کوفہ کو خیرباد کہہ دیا تھا اور مدینہ میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ اب جب یزید کو خلافت ملی تو اہل کوفہ کی محبت اہل بیت کیلئے جوش میں آئی اور انہوں نے خطوط کے ذریعے امام حسین کو خلافت کیلئے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ امام حسنؓ اہل کوفہ کی نفسیات اور صورتحال کی نزاکت کو اچھی طرح جان چکے تھے، اسی لئے اپنے بھائی کو وصیت میں اہل کوفہ کے بارے میں اپنی آراء سے آگاہ کر چکے تھے کہ: کوفہ والوں کے فریب میں مت آنا اور میں اچھی طرح جان چکا ہوں کہ نبوت اور خلافت دونوں ہمارے خاندان میں جمع نہیں ہو سکتیں اس لئے تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ تم اس معاملے میں خاموش رہو"۔

لیکن حضرت حسینؓ اپنے لئے ایک کردار کا انتخاب کر چکے تھے وہ تھا "خلافت منہاج نبوت کا تحفظ" اور اس ادارے کے انہدام سے اہل اسلام کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اس سے بھی امت مسلمہ کے اعصاب پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کے سامنے شہادتِ عثمانؓ کا واقعہ رونما ہوا، ان شورشوں نے حضرت حسینؓ کے اعصاب پر بھی بہت گہرا اثر چھوڑا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف فتنوں نے پہلے اموی خلیفہ کے زمانے میں قصرِ خلافت کو بری طرح اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے بھی مسلمانوں کو باہم خانہ جنگی سے بچانے کیلئے اپنی جان قربان کر دی حالانکہ اس وقت مدینے کے وفادار مسلمانوں کی جماعت آپ کے مکان پر موجود تھی اور بنو ہاشم کی تو ایک بڑی جماعت ان کی معاون و مددگار بھی تھی لیکن حضرت عثمانؓ نے ان سب کو قسم دلا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر حملہ سے روک رکھا تھا اور اپنے گھر بیٹھ کر قرآن کریم کی تلاوت فرماتے رہے۔ دراصل وہ بھی شریعت کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے کہ :

وَقَاتِلُوافِی سَبِیلِ اللّٰہِ الَّذِینَ یُقَاتِلُونَکُمْ وَلَاتَعْتَدُوا ِنّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِینَ اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور زیادتی نہ کرو بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۃ بقرہ۔ ۱۹۰)

"اپنی طرف سے جارحیت کا آغاز بندۂ مومن کیلئے کسی طور پر بھی جائز نہیں کہ مسلمان دعوت و نصیحت کے ذریعے کوئی خیر کی راہ نکالتا ہے نہ کہ قتال کا راستہ اختیار کرکے، اس کے بعد اگر دوسروں کی طرف سے جارحیت کا آغاز ہو تو دو صورتیں ہیں، جارحیت کا آغاز اگر کفار کی طرف سے ہو تو پھر بھی مخصوص شرائط کے تحت اس کے دفاع کا حکم ہے

لَئِنْ بَسَطتَ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَااَنَابِبَاسِطِ یَدِیْ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ اِنِّی اَخَافُ اللّٰہُ رَبَّ الْعَالَمِیْنْ

لیکن اگر جارحیت کا آغاز اگر مسلمان کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ دفاع کے طور پر بھی اپنے دینی بھائی پر وار نہ کیا جائے۔ "اگر تو نے مجھے مارنے کیلئے اپنے ہاتھ کو بڑھایا تو میں تجھے کو مارنے کیلئے اپنے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا" (سورۃ المائدہ۔ ۲۸)

ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے آنے والے فتنے سے جب ڈرایا تو لوگوں نے پوچھا کہ ہم کو آپ ﷺ کا کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اس میں اپنی کمانوں کو توڑ ڈالو' اپنی تانت کو کاٹ ڈالو، اپنی تلواروں کو پتھر پر پٹک دو' اپنے گھروں کے اندر بیٹھے رہو، اگر تم کو مارنے کیلئے کوئی تمہارے گھر میں گھس آئے تو تم آدم علیہ السلام کے دو لڑکوں میں سے بہتر لڑکا بنو، قتل ہو جاؤ مگر قتل نہ کرو"۔

لیکن حضرت امام حسینؓ کے سامنے اس عظیم المرتبت کارنامے کے بعد آنے والے واقعات نے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح کردی کہ اگر یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ بن عفان نے اصول شریعت کی اتنی بڑی عملی مثال قائم کردی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بہتر بیٹا بن گئے، حضرت عثمانؓ "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کا دفاع کرتے (اور اس ادارہ خلافت کی حفاظت کی خاطر چند ہزار انسان مار دیئے جاتے تو یقیناً خلافت کا ادارہ انتشار اور انار کی سے محفوظ رہتا اور حضرت علیؓ جو ساری توانائیوں کے باوجود اپنے دور خلافت کے پانچ سال ان شورشوں اور باہمی جنگ وجدل پر قابو نہ پاسکے اور بالآخر ان منہ زور فتنوں نے ان کی جان لے لی) تو آج خلافت کیلئے مسلمانوں میں آپس میں ایسی خونریزی نہ ہوتی اور تاریخ اسلام میں جنگ جمل اور جنگ صفین اور بعد کے سانحات کیلئے کوئی جگہ نہ ہوتی۔

اسی طرح حضرت حسنؓ کو مسلمانوں نے اپنی آزاد مرضی سے بلاجبر واکراہ خلیفہ مقرر کیا تھا' وہ نہ صرف برحق خلیفہ تھے بلکہ ان کی خلافت بھی منہاج نبوت پر قائم تھی' ان کے مقابلے میں حضرت امیر معاویہ کا دعویٰ خلافت ویسا ہی بلاجواز تھا جیسا حضرت علیؓ کے مقابلے میں، کیونکہ خلیفہ کے انتخابات اور تقرر کا اختیار اہل شوریٰ یعنی اہل حجاز کے جلیل القدر صحابہ رضوان علیہم کو حاصل تھا۔ حضرت امیر معاویہ کا شمار طلقاء میں تھا، اس لئے طلقاء کو خلافت کے تقرر میں کوئی عمل دخل حاصل نہ تھا۔ حضرت معاویہ کا حضرت علیؓ کے خلاف محاذ آرائی، تصادم، اطاعت سے انکار اور بغاوت کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ مرکزی حکومت میں بطور ماتحت خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کا شوریٰ سے کوئی تعلق نہ تھا' اس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی خلیفہ برحق تھے۔ وہ خلافت کے ادارے کے محافظ تھے۔ اس ادارے کے تحفظ اور دفاع کیلئے جو جنگیں لڑیں ان میں حضرت علیؓ حق پر تھے' اور ان جنگوں کے نتیجے میں جو خون خرابہ ہوا اس کی بھی ذمہ داری حضرت علی پر ہرگز عائد نہیں ہوتی۔

حضرت حسینؓ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ حضرت معاویہ کے اس طرزِ عمل نے حضرت حسنؓ کو بھی اسی دوراہے پر کھڑا کردیا تھا جہاں وہ آج ہیں' یا تو وہ خلافت کے ادارے کا تحفظ فرماتے یا مسلمانوں کو خانہ جنگی کے منہ زور فتنے سے بچالیں۔

حضرت حسنؓ نے امن پسندی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کو تو خانہ جنگی سے بچالیا لیکن انہیں "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے انہدام کا صدمہ یقیناً برداشت کرنا پڑا۔ اس حکمت عملی نے امت سے بڑی بھاری قیمت وصول کی اور بعد میں حضرت حسینؓ اور اہل حجاز کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حضرت حسینؓ نے اپنے والد گرامی حضرت علیؓ کو بھی خلافت کے ادارے کی حفاظت کی خاطر شہید ہوتے دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ حضرت حسنؓ نے ان تمام حالات کا

عملی مشاہدہ کرتے ہوئے اپنے لئے غیر سیاسی طریق کار کا انتخاب کیا، اس پر نہ صرف عمل کیا بلکہ اپنے بھائی کو بھی اس کی وصیت کی لیکن حضرت حسینؓ نے اپنے لئے سیاسی طریق کار راستہ منتخب کر کے اپنے والد حضرت علی کی سنت پر عمل کیا یہاں امام حسن کے غیر سیاسی طریق کار کی وضاحت از حد ضروری ہے۔ اس کیلئے پہلے ہمیں مستند احادیث اور اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں سے مدد لینا ہوگی۔ یزید کے مقابلے میں جو صورتحال حضرت حسینؓ کو پیش آئی اس سے کہیں زیادہ مشکل حضرت حسنؓ کو حضرت معاویہ کے مقابلے میں پیش آچکی تھی مگر آپ نے اس سے مختلف رد عمل کا اظہار کیا جس کا نمونہ ہمیں حضرت حسینؓ کے آخری خطبہ سے بھی ملتا ہے جہاں حضرت حسین نے بھی جنگ وجدل سے بچنے کیلئے تین شرائط پیش کی تھیں۔ (طبری جلد ۴ صفحہ ۳۱۳)

احادیث کی کتب میں حسنین کے بارے میں بہت سے روائتیں ملتی ہیں جن میں حضرت حسینؓ کیلئے زیادہ تر "محبت" کا ذکر ہے جو نواسہ ہونے کی حیثیت سے آپ کیلئے بالکل فطری ہے اور دوسری طرف امام حسنؓ کے بارے میں جو روایات نہ صرف سنداً زیادہ قوی ہیں بلکہ فطری محبت سے آگے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ مثلاً حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ: حسنؓ بن علیؓ سے زیادہ کوئی شخص نبی اکرم ﷺ سے مشابہ نہ تھا"۔ طبعی مشابہت کے علاوہ یہ ایک واقعہ بھی ہے کہ صحیح روایات میں امام حسینؓ کیلئے کوئی پیشگی کردار کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور دوسری طرف یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے امام حسنؓ کے بارے میں ایک عظیم کردار کرنے کی پیشین گوئی ارشاد فرمائی تھی۔

حضرت ابو بکرؓ صدیق فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اکرم ﷺ کو منبر پر دیکھا جہاں حسنؓ بن علیؓ آپ کے پہلو میں تھے۔ ایک بار آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور دوسری بار ان کی طرف، اور فرماتے تھے یہ میرا لڑکا ہے، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کروادے۔ (بخاری)

رسول کریم ﷺ کی یہ پیش گوئی امام حسنؓ کی زندگی میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت امام حسن کی بیعت ۴۰ھ میں اس حال میں ہوئی کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ بنوامیہ اور بنو ہاشم کی رقابت عروج پر تھی، نہ تو یہ ایک دوسرے کو ختم کر سکے تھے اور نہ ہی ہار ماننے کو تیار تھے۔ حضرت حسنؓ نے جب بیعت لی تو آپ نے لوگوں سے یہ اقرار بھی لیا کہ "میں جس سے جنگ کروں گا تم اس سے جنگ کرو گے 'جس سے میں صلح کروں گا تم اس سے صلح کرو گے"۔ اب حضرت حسنؓ کی خلافت گویا حضرت معاویہ کیلئے نیا چیلنج تھی۔ اس کے مقابلے کیلئے میدان میں جہاں حضرت معاویہ کا ساٹھ ہزار کا لشکر دمشق سے چلتا مدائن کے میدان میں پہنچا تھا وہاں امام حسنؓ بھی اتنی ہی قوت کا لشکر

کوفہ سے لیکر مقابلے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ گویا پہاڑوں کا لشکر آمنے سامنے تھا بلکہ امام حسنؓ کے سپاہی تو حضرت علیؓ کے ہاتھ پر موت کی بیعت بھی کر چکے تھے اور لڑنے مرنے سے کم کسی چیز پر بالکل آمادہ نہ تھے۔

مدائن کے میدان میں معاویہ بن سفیان نے امام حسنؓ بن علیؓ کو یہ پیغام بھیجا کہ "جنگ سے بہتر صلح ہے' مناسب یہ ہے کہ آپ مجھے خلیفہ تسلیم کرلیں اور میرے ہاتھ پر بیعت کرلیں"۔ امام حسنؓ نے غور و فکر کے بعد اس پیشکش کو منظور فرمالیا اور خلافت امیر معاویہ کے سپرد کر دی حالانکہ امام حسن کے پرجوش حامیوں کو یہ "بات" قبول نہ تھی۔ آپ نے ایک تاریخی فقرے میں اپنا جواب دیا:

خلافت اگر معاویہ کا حق تھا تو ان کو پہنچ گیا' اگر میرا حق تھا تو میں نے ان کو بخش دیا"۔

اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہ نے حضرت امام حسنؓ کیلئے ایک لاکھ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا (حافظ ذہبی العبر جلد اصفحہ ۴۸)

اس طرح امام حسنؓ کے پیچھے ہٹ جانے سے مسلمانوں کا باہمی اختلاف باہمی اتفاق میں تبدیل ہو گیا اور مدائن کا میدان اسلامی تاریخ میں جمل و صفین کے بعد تیسری خونریزی کے عنوان سے بچ گیا اور مسلمانوں کی وہ قوت جو خلیفہ ثالث کے زمانے سے باہمی جنگ وجدل میں مصروف تھی اور جن کی وجہ سے اسلامی فتوحات کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تھا، اب دوبارہ اسلامی فتوحات کی خبریں بہم پہنچا رہا تھا اور اسلام کی اشاعت و توسیع جو ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے رک گئی تھی' اس کا بھی بند دروازہ جس نے کھولا وہ حضرت امام حسنؓ ہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیچھے ہٹنا سب سے بڑی بہادری ہے۔ اگرچہ بہت کم لوگ ہیں جو اس بہادری کیلئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں' بظاہر تو یہ میدان سے واپسی کا فیصلہ تھا' اس سے مسلمانوں کی قوت باہم مقابلہ آرائی سے بچ گئی اور اسی طاقت نے مسلمانوں کی فتوحات کا خارجی میدان میں سکہ بٹھا دیا۔ اگر اس وقت حضرت امام حسنؓ خلافت پر اصرار کرتے تو عجب نہیں مسلمان پہلی صدی ہجری میں آپس کی خانہ جنگیوں میں برباد ہو جاتے اور اسلام جو آج ایک عالمگیر مذہب چین سے لیکر مراکش تک اپنی برکات سے ہمیں فیض یاب کر رہا ہے اس کی شکل کچھ اور ہوتی تو گویا غیر سرکاری طریق کار سے اختلاف کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی

کیونکہ بعد کے حالات نے حضرت حسنؓ کے اس کردار کو بلاشبہ امت محمدیہ ﷺ پر ایک گراں قدر احسان ثابت کیا ہے۔
لیکن اس کے ساتھ حضرت حسینؓ کے کردار پر نگاہ ڈالیں تو ان کے بھی طریق کار کو ایسی تقویت ملتی ہے کہ جس نے "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے تحفظ' دفاع اور اس کے احیاء کیلئے قربانیوں کی ایک ایسی پرعزم تاریخ رقم کی ہے جو قیامت تک مظلوموں کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔
حضرت امام حسینؓ نے خلافت کے ادارے کو بچانے کیلئے کوفہ کے لوگوں کے سخت اصرار پر اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلمؓ بن عقیلؓ کو کوفہ روانہ کیا' گو حضرت مسلمؓ بن عقیل اس منصوبے سے متفق نہ تھے تاہم حضرت حسینؓ کے اصرار پر کوفہ چلے گئے۔ تاریخی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً اٹھارہ ہزار آدمی نیابتاً ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکے تھے لیکن جب یزید کے حکم پر عبیداللہ بن زیاد نے حضرت مسلمؓ بن عقیل اور ان کے کوفی میزبان ہانی بن عروہ کو محل کی چھت پر کھڑا کرکے قتل کر دیا تو کوفہ والوں کو گویا یزید کا پہلا پیغام تھا کہ حضرت حسینؓ کی بیعت کی قیمت کیا ہو گی۔ اسی وقت کوفہ والے خاموش اپنے گھروں میں دبک گئے اور حضرت حسینؓ جو کہ ان بے وفا لوگوں کی قیادت کیلئے آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکے تھے' اپنے سفر سے بالکل واپس نہ لوٹے حالانکہ مکے میں تمام جلیل القدر صحابہ رضوان اللہ علیہ اجمعین نے ان کو اس سفر سے منع کیا تھا ۔ عبداللہؓ بن عمر، عبداللہؓ بن عباس، عمروؓ بن سعدؓ بن العاص، عبدالرحمٰنؓ بن حارث اور مکہ کے دوسرے بزرگوں نے شدت سے حضرت حسینؓ کو منع فرمایا بلکہ حضرت عبداللہؓ بن زبیر نے کہا کہ آپ کوفہ جانے کی بجائے مکہ کی حکومت قبول فرمائیں' آپ ہاتھ بڑھائیں میں سب سے پہلے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔
عبداللہؓ بن جعفر بن ابی طالب نے مدینہ سے خط لکھ کر بااصرار منع کیا لیکن حضرت امام حسینؓ کی اولوالعزم طبیعت اس پر کسی طور راضی نہ ہوئی، حتّی کہ انہوں نے حضرت عبداللہؓ بن عباس کی اس آخری بات کو بھی ماننے سے انکار کر دیا کہ عورتوں اور بچوں کو مکہ میں چھوڑ کر سفر کریں یا کم از کم حج کے بعد روانہ ہوں جس میں صرف چند دن باقی ہیں۔
امام حسینؓ ذوالحج ۶۰ ھ کے پہلے ہفتے میں کوفہ کے راستے میں حضرت عبداللہؓ بن مطیہ سے جب ملے تو انہوں نے بصد احترام حضرت امام حسینؓ سے کہا: "میں آپ کو قسم دلاتا ہوں کہ آپ واپس مکہ تشریف لے جائیں، اگر آپ بنوامیہ سے خلافت چھیننے کی کوشش کریں گے تو وہ ضرور آپ کو قتل کر ڈالیں گے اور پھر ہر ایک ہاشمی ہر ایک عرب اور ہر ایک مسلمان کے قتل پر دلیر ہو جائیں گے"۔ لیکن حضرت امام حسینؓ نے واضح الفاظ میں اپنے رفقاء کو بتا دیا تھا کہ ان کے پیش نظر "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے احیاء کے سوا کچھ نہیں۔ اسلامی نظام اطاعت میں خلافت کی جو اہمیت ہے اس سے

حضرت حسینؓ پوری طرح باخبر تھے۔ اسلامی نظام اطاعت کے استحکام کیلئے اولی الامر کے ادارہ کو جس انداز میں رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین نے قائم فرمایا تھا' اس کے تحفظ اور دفاع کیلئے حضور اکرم ﷺ نے جو تاکید فرمائی تھی وہ بھی حضرت حسینؓ کے علم میں تھی۔ معاویہ بن ابی سفیان کے مقرر کردہ خلیفہ یزید بن معاویہ نے اس ادارہ کی تعظیم اور تقدس کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ اس ادارہ کے انہدام سے اسلامی معاشرہ کو دینی اور سیاسی نقصان جو پہنچ رہا تھا اس کو دیکھ کر حضرت حسینؓ جیسی شخصیت کا بیٹھ جانا بڑا مشکل تھا۔

تاہم آخر وقت میں کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کو صورتحال کا اندازہ ہو گیا تھا۔ حضرت مسلمؓ بن عقیل کی شہادت، کوفہ کے لوگوں کی بے وفائی' یزید کے لشکر جرار کے مقابلے میں آپ کا مختصر قافلہ بظاہر پہاڑ اور چیونٹی کا مقابلہ لیکن حضرت حسینؓ نہائت بہادر' جرأت مند اور انتہائی شریف النفس تھے۔ وہ موت سے بالکل خوفزدہ نہیں تھے مگر اپنے ساتھ نیز عورتوں اور بچوں کیلئے اپنے دل میں جذبہ رحم کی پیدائش کو روکنا ان کیلئے ممکن نہ تھا چنانچہ آخری دن محرم الحرام کی دس تاریخ ۶۱ھ کربلا کے میدان میں یزید کی فوج کے سامنے جو تقریر فرمائی وہ فصاحت و بلاغت کا بے نظیر شاہکار ہے۔ آپ نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

''عیسیٰ کا گدھا اگر باقی ہوتا تو تمام عیسائی قوم قیامت تک اس کی پرورش کرتی' تم کیسے مسلمان اور امتی ہو کہ نبی ﷺ کے نواسے کو قتل کرنا چاہتے ہو''!

دراصل کوئی دوسری قسم کا مسئلہ ہوتا تو کوئی مسلمان شائد عیسائیوں سے چار ہاتھ آگے ہوتے لیکن یہاں یزید کے لشکر کے سامنے نواسہ رسول ﷺ ان کے سیاسی حریف کے طور پر کھڑے تھے اور سیاسی حریف کو نہ مسلمان بخشنے کو تیار ہوتے ہیں نہ عیسائی۔ وہی یزید جس نے ۶۴ھ میں مدینہ پر چڑھائی کی تھی اس نے مسلم بن عتبہ کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ حضرت امام حسینؓ کے صاحبزادے حضرت زین العابدینؓ کا پورا پورا خیال رکھنا کیونکہ وہ مدینے میں سیاسی زندگی سے الگ ہو کر مدینہ کے نواح میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے کیونکہ یزید نے اپنے باپ سے سیاست کا ایک اصول ورثے میں جو لیا تھا اس پر بڑی سختی سے کاربند تھا: ''میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہوں''۔ (ابن تاثیر کامل جلد ۴ صفحہ ۵)

چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ آخر وقت میں حضرت حسین یزید سے صلح کیلئے راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے یزید کے نمائندے عبید اللہ بن زیاد کے سامنے تجاویز پیش کیں:

۱۔میں مکہ واپس چلا جاؤں اور وہاں خاموشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤں۔

۲۔مجھے کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو کہ وہاں کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں۔

حضرت حسین کے رویے میں تبدیلی سے یزید کی فوجوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی،اگرچہ کربلا کے میدان میں وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے'اس کے باوجود نواسہٗ رسول کے احترام کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے لوگ مل کر نماز ادا کرتے تھے اور اکثر حضرت حسینؓ ہی کی اقتداء میں نماز ادا کرتے تھے۔عبیداللہ بن زیاد کے پاس جب یہ پیغام پہنچا تو وہ بھی بغیر لڑائی کے اس عمدہ حل پر بہت خوش ہوا لیکن اس کا مشیر شمر ذی الجوشن جو کہ حضرت حسینؓ کا پھوپھا اور انتہائی بری طبیعت کا مالک تھا،اس نے عین وقت پر عبیداللہ بن زیاد کا ذہن پھیر دیا۔اس نے حضرت حسینؓ کے لوٹنے کے سارے راستے بند کر دیئے اور بالآخر کربلا کا وہ معرکہ جس میں عمرو بن سعد نے پہل کر کے حضرت حسینؓ کے قافلے پر پہلا تیر پھینک کر اس کا آغاز کیا تھا جس کا انجام حضرت حسینؓ کی شہادت پر منتج ہوا۔یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ عمرو بن سعد حضرت حسینؓ کا رشتے میں ماموں اور شمر ذی الجوشن پھوپھا تھا۔

تاریخ کے ان دو کرداروں پر ملت اسلامیہ قیامت تک جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔گو حضرت حسینؓ نے بھی آخری وقت میں حضرت حسن کے غیر سیاسی طریقہ کار کو بھی عمل میں لانے کی کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت حسین سے "خلافت علیٰ منہاج نبوت" کے تحفظ اور دفاع کا کام لیکر ان سے بے مثال قربانی لینا مقصود تھی اور ان کی شہادت سے امت مسلمہ تک یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا کہ حالات کیسے ہی پر آشوب اور دگرگوں ہوں'اسلامی نظام حکومت'اسلامی نظام اطاعت کے قیام و نفوذ جو کہ ایمان کے اوّلین تقاضوں میں سر فہرست ہیں کی کوشش ہر وقت، ہر زمانے میں جاری رکھنی چاہیے جب تک خلافت کے ادارہ کو مکمل اس کی اصلی شکل میں بحال نہ کر لیا جائے۔اس کے علاوہ بھی ان کرداروں میں بے شمار دوسرے اسباق ہمارے لئے موجود ہیں'صرف شرط یہ ہے کہ ہم خود مخلص ہوں۔

خوشا وہ آبلہ پا کارواں اہل جنوں

لٹا گیا وہ بہاروں پہ اپنی سرخیٔ خوں

# مشکلات اور اس کا حل

آج کسی بھی ٹی وی چینل یا کسی اخبار کو دیکھ لیں تو ہمیں ہر جگہ دم توڑتی ہوئی انسانیت کے روح فرسا مناظر دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔
زندگی جو کہ بہت مختصر ہے بے شمار مسائل کا شکار ہو چکی ہے۔ان مسائل کا حل تو در کنار اب تو یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ ان مسائل حیات کو گنا جاسکتا ہے۔روٹی کپڑے مکان کا مسئلہ 'تعلیم کا مسئلہ 'جنگ و امن کا مسئلہ 'انفرادی و اجتماعی 'معاشی و معاشرتی 'ذہنی و نفسیاتی 'خانگی و تمدنی 'تہذیبی و مذہبی 'فکری و جذباتی 'قومی و بین الاقوامی 'شعوری و لاشعوری مسائل اور پھر ہر مسئلے کے شاخ در شاخ اجزاء ان تمام مسائل کے دیو پیکر لامتناہی جال نے ہماری زندگی کی زمین و آسمان کو جکڑ رکھا ہے بلکہ اب تو ہلنے کی بھی تاب نہیں۔
اب ایک طرف تو ان مسائل نے زندگی پر یورش کر ڈالی ہے 'دوسری طرف حوصلہ فرسا مناظر کہ ان میں کسی بھی ایک مسئلہ کا کامیاب حل آدمی کی خود ساختہ تدابیر کے ہاتھوں انجام نہیں پاسکا 'جو تدبیر عمل میں لائی گئی اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا 'جو دوا استعمال کی اس کا الٹا رد عمل ہوا۔اب تو ہزاروں تدابیر کی ناکامیاں بھی ان گنت مسائل کے ڈھیر میں اضافہ کا موجب بن چکی ہیں اور ان مصائب کی لاشوں کے درمیان سے مسائل سر اٹھا کر آدمی کا پھر سے تعاقب شروع کر دیتے ہیں اور آدمی ان مسائل کی طرف خوف مایوسی اور اضطراب و کرب کے ناگفتہ بہ عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے ' کبھی گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا ہے ' کبھی ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا بھی ہے مگر جلد ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ اٹھتا ہے لیکن مسائل زندگی کے اس ہجوم سے اس کو برائے نام بھی نجات نہیں ملتی کیونکہ زندگی کے یہ عملی مسائل زندگی کے ایسے ٹھوس مسائل بن گئے ہیں کہ آدمی ان سے جتنا دور بھاگتا ہے یہ اتنے قریب آجاتے ہیں۔یہ جب ان سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے مسائل اس کا دامن پکڑ کر تمام راستے مسدود کر دیتے ہیں۔ اگر یہ خاموش ہوتا ہے تو یہ اس کو آواز دیکر اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔اگر انسان چیخنے لگتا ہے تو مسائل خاموش تماشائیوں کے ہجوم کی شکل اختیار کر لیتے ہیں 'انسان اگر سوتا ہے تو پریشان خوابوں کے آسیبی حملوں کی شکل میں مسائل کا دیو سوار ہو جاتا ہے۔بیداری کی شکل میں اپنا ہی منہ نوچ لینے کی ترغیب ذہن میں سوار رہتی ہے۔اگر ان مسائل پر قہقہہ مارنا چاہے تو مسائل کی آہ و زاری میں اس کی آواز دب کر رہ جاتی ہے۔اگر رونا چاہے تو مسائل انسان کی بزدلی پر قہقہے لگاتے ہیں یعنی کہیں اور کسی طرح بھی وہ ان مسائل کی زد سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

آخر ان مسائل سے نجات کا کوئی راستہ بھی ہے ؟ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان کو واقعی حل کیا جائے۔ان کو بھلایا یا ٹالا نہیں جا سکتا،ان کو گھٹانے اور ہٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔مسائل زندگی کے ساتھ شروع تو ہوتے ہیں لیکن زندگی کے ساتھ ختم نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے بعد یہ آدمی اپنے مسائل کا بوجھ اپنے لواحقین کیلئے چھوڑ جاتا ہے اور کچھ مسائل کی جوابدہی کا گراں بوجھ اپنے سر پر لئے دوسری دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں سے وہ اپنی خبر کو بھی پہنچانے سے قاصر ہے اور نہ ہی کسی دوسرے شخص کی

ہمت ہے کہ اس کی معمولی سی بھی مدد کر سکے۔ان مسائل کے شور نے انسانی زندگی کو گوشہ محشر بنا کر رکھ دیا ہے۔جہاں خاندانی نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے وہاں معاشرتی نظام پارہ پارہ ہو چکا ہے۔جہاں قومی ڈھانچہ بگڑا، وہاں بین الاقوامی زندگی تلپٹ ہو رہی ہے۔ نظریں سراسیمہ اور کان پھٹے جا رہے ہیں۔دل و دماغ سرد بگریباں ہیں۔ جنسی انارکی قیامت بن چکی ہے۔عدالتی نظام تماشہ ہو گیا ہے ۔تعلیمی اداروں میں مجرموں کی پرورش ہو رہی ہے'بیویاں شوہروں سے بے وفائی کر رہی ہیں اور شوہر بیویوں کی حق تلفی کر رہے ہیں اور اولاد ماں باپ سے نہ صرف گستاخ ہے بلکہ حملہ آور ہے۔پولیس مجرموں کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ عملی ایجادات کی کوکھ سے تباہ کاریاں جنم لے رہی ہیں، روحانی سکون کا تصور تک محال ہو چکا ہے۔جسمانی کھنڈروں میں بیماریوں اور وباؤں کا طوفان برپا ہے اور یہ سب کچھ اس دور میں ہو رہا ہے جہاں زندگی کے اسباب و وسائل اپنے نقطہ عروج پر ہیں۔آسمان کے دور افتادہ گوشے بھی آج سائنس کی بدولت منور ہو چکے ہیں مگر زندگی زمین کی سیاہ رات میں دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔انسان کے ہاتھ کی تخلیق آج کشش ارضی سے نکل کر کسی اور جہاں میں محوِ پرواز ہے لیکن زندگی کو زمین پر چلنا دوبھر ہو گیا ہے۔انسانی آلات آج خطرناک امراض کا سینہ چیر کر غیر مرئی جراثیم کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں لیکن انسان کی زندگی پھر بھی گھٹ رہی ہے۔آخر ان تمام ناکامیوں کا سبب کیا ہے؟ یہ جو مسائل کا دائرہ کار بڑھتے بڑھتے ہماری زندگیوں کو گھنا رہا ہے آخر اس کی حد کہاں ختم ہو گی؟ ان مسائل کا نقطہ آغاز ہے کیا؟ یہ ہیں چند سوالات جو کہ پھر سے آج ذہنوں میں کلبلا رہے ہیں۔آج فرد اپنے انفرادی مسائل اور قومیں اپنے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کیلئے سنجیدگی سے خواہاں ہیں تو ان کو اس زاویے سے اپنی سوچ کا آغاز کرنا ہو گا کہ بنیاد کی درستگی ہی پوری عمارت کی درستگی ہے۔ جس طرح بیج کے اندر جھانک کر پورے درخت کی گزشتہ و آئندہ تاریخ کا بھرپور مطالعہ ممکن ہے'ایٹم کے اندر کائنات کی اصل تصویر کا مطالعہ ممکن ہے'اسی طرح ہر شئے اپنی اصل ہی سے چلتی ہے اور اصل ہی کی طرف لوٹتی ہے۔زندگی کی ہر حقیقت ایک گولائی کا سفر ہے" کل شئی یرجع الی اصلہ" ہر شئے جہاں سے شروع ہوئی ہے وہی لوٹ کر آتی ہے۔"

" تو گویا مسائل کے نقطہ آغاز کا سراغ ان کی انتہا اور انجام کا سراغ ہے"۔

جب سے انسان نے اپنے مسائل کو خدا سے بے نیاز ہو کر خود حل کر لینے کی ہولناک حماقت کا ارتکاب کیا ہے'آج تک کسی مسئلے کا دائمی حل نہیں کر سکا اور نہ ہی کر سکے گا۔ان تمام مسائل کو حل کرنے کیلئے زندگی کے اس سفر کا از سر نو آغاز کرنا ہو گا اور اسی انداز میں کرنا ہو گا جیسا اس کائنات کے خالق نے بتا رکھا ہے کیونکہ زندگی ایک ایسا پیچ و خم سے بھرپور راستہ ہے کہ قدم قدم پر مسائل کے پڑاؤ ہیں'فکر و نظر اس سفر کا نقشہ اور خاکہ ہیں اور اخلاصِ نیت اس خاکہ میں رنگ بھر کر اس سفر کی منزل تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو گی اور منزل کا نام ہے"ہدائت"!

ہدائت خدا نے کسی کے ہاتھ میں نہیں رکھی'یہ وہ تحفہ ہے جو صرف خدا کے دستِ خاص سے ہی مل سکتا ہے۔خود خدا کا در ہی اس متاع بے بہا کو طلب کرنے کا واحد آستانہ ہے۔اس در کو چھوڑ کر ہدائت کیلئے آدمی نے جس دروازے پر بھی دستک دی ہے اس کو ضلالت

ہی ملی ہے۔ علم جہل اور عقل دیوانگی کی شکل میں اس کے دامن میں آئی ہے۔ اسی طرح دولت افلاس اور سامان بے سروسامانی کی شکل میں ڈھل گیا ہے۔ آج کامیابی اور فلاح کا سامان جتنا انسان کے پاس موجود ہے اتنا کبھی نہیں تھا لیکن آدمی آج جس قدر کامیابی سے محروم اور تہی دامن ہے اتنا شائد کبھی نہ تھا۔ اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ انسان نے خدا سے اپنا تعلق یا تو منقطع کرلیا ہے یا پھر اگر ہے تو اس کے یقین کی کمی آگئی ہے۔ یہ ہے وہ اصل چیز جس نے عہد حاضر کو کامیاب ساز وسامان کے باوجود مکمل طور پر ناکام کردیا ہے۔

اب جب کہ حالات وواقعات نے ثابت کردیا ہے کہ آدمی کبھی خود کچھ نہیں کرسکا اور جب بھی کچھ ہوا ہے وہ اس نے خدا سے کروایا ہے تو پھر کیوں نہ خدا سے تمام مسائل کو حل کرانے کی راہ پکڑی جائے۔ اس کیلئے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آدمی جو علم کو عمل کا محتاج سمجھتا ہے اور پھر اس عمل کو خدا کا درجہ دیکر اس کی پرستش شروع کردیتا ہے' اس سے تائب ہو کر خدا کو روح عمل اور اصل فعال قوت سمجھ کر خدا کا پجاری بن جائے۔ وہ جان لے کہ جس طرح عمل علم کا محتاج ہے اسی طرح علم بھی اللہ کا محتاج ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے صرف تھوڑی دیر کیلئے اپنی زندگی کے سفر پر ہی نگاہ ڈال لے جو زمین پر اس کے ظاہر ہونے سے قبل کہاں سے شروع ہوا۔ رحم مادر سے لیکر پیدائش تک کس کا محتاج تھا' پھر پیدائش سے لیکر لڑکپن اور جوانی تک ماں باپ اور دوسرے وسائل کا دستِ نگر رہا' کہیں بھی اس نے اپنا مسئلہ خود حل نہیں کیا بلکہ خدا کا ہاتھ ہی اس کے مسائل کو حل کرتا رہا۔ پھر اس مختصر زندگی کے بعد موت کے وقت سے اپنے مٹائے جانے کے مراحل تک پھر خدا اور اس کی ہدائت کا قطعی محتاج۔ کوئی اس کو بناتا ہے تو یہ بن جاتا ہے' کوئی مٹاتا ہے تو اس کی مجال نہیں کہ اس کے حکم کی روگردانی کرسکے۔ پھر اس کو مٹائے جانے کے بعد بنائے جانے کے باب میں تو وہ قطعی طور پر خدا کا محتاج ہوگا۔

پھر کیسا یہ ظلم ہے کہ باوجود ان تمام حقائق کے کہ وہ شروع میں بھی خدا کی ہدائت کا محتاج' اس کا انجام بھی خدا کی ہدائت کا محتاج لیکن رحمِ مادر سے لیکر قبر تک وہ اس خدا سے بے نیاز ہو کر چلنا چاہتا ہے۔ بس اسی احمقانہ ارادے کی بدولت اس نے دنیا میں تباہی پھیلا رکھی ہے اور اب ان تمام مسائل میں ایسا الجھا ہے کہ اس کو سلجھانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں رہی۔

قرین انصاف تو یہ ہے کہ ایسے باغی کیلئے ہدائت کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں لیکن اس کریم رب نے اس محتاج ہستی کیلئے فرشتوں کو زمین پر اتارا' اپنے انبیاء ورسل کا سلسلہ جاری فرما کر ہدائت کے دروازے کھول دیئے اور وعدہ فرمایا کہ اگر تم واپس میرے طرف ہدائت کیلئے رجوع کرو گے تو تمہارا استقبال کیا جائے گا۔" والذین جاھدو افینا

النھدینھم سبلنا''یعنی ہماری راہ میں سعی و عمل کرو گے'ہم سے ہدائت طلب کرو گے تم پر کامیابی کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ قوموں سے وعدہ فرمایا''ان تنتصر و اللہ ینصر کم''کہ اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو تمہاری مدد کی جائے گی۔

یہ ہے دراصل وہ ہدائت جس کے بغیر کوئی بھی فرد مسائل حیات کی صحیح راہ دریافت نہیں کر سکتا' پھر کیوں نہ اس خدا سے راہِ ہدائت طلب کی جائے جس کے وعدوں کو ہم کئی دفعہ آزما چکے ہیں۔ کیوں نہ خدا سے مانگنے کا ڈھنگ سیکھیں اور زندگی کی دو عملی سے توبہ کر کے آج ہی اس کے دربار میں جھک جائیں۔ آج جن الفاظ میں ہم اپنے رب کی ہدائت کے طالب ہیں ان میں تبدیلی لائیں'زبان سے نہیں بلکہ اپنے قلب کو اس کی طرف متوجہ کر کے ہدائت کے طالب بنیں۔ ہم اپنی حقیقی زندگی سے جو چاہ رہے ہیں وہی دراصل اپنے رب سے مانگ رہے ہیں۔ خدا ہمارے لفظوں کو نہیں بلکہ ہمارے قلوب اور اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ہم اپنے اصل وجود میں جس چیز کے طلبگار ہیں اس کیلئے بے قرار بھی ہیں؟

جس طرح یہ ممکن نہیں کہ بچہ ماں سے روٹی طلب کرے اور ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے اسی طرح خدا جو ماں سے ستر گنا زیادہ مہربان ہے اس کو کیسے گوارہ ہے کہ بندہ اس سے ہدائت طلب کرے اور وہ اس کو گمراہیوں میں بھٹکنے دے۔ بندہ خدا سے خشیت مانگے تو خدا اسے قساوت دے' بندہ خدا کی یاد مانگے تو وہ اسے نسیاں میں مبتلا کر دے' بندہ آخرت کی تڑپ مانگے اور وہ اس کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ بندہ کیفیت سے بھری دنیا داری مانگے اور وہ بے روح دنیاداری میں مبتلا کر دے۔ بندہ خدا سے حق پرستی مانگے اور وہ شخصیت پرستی کی تاریک راہوں پر ڈال دے۔ گویا ہماری مطلوب چیز کا نہ ہونا اس کا ثبوت ہے کہ ہم نے اپنے رب سے مانگا ہی نہیں۔ اگر ہمیں دودھ خریدنا ہو تو چھلنی لیکر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے باوجود ہم خالی ہاتھ لوٹیں گے۔ اسی طرح زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہوں لیکن اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو گویا نہ ہم نے مانگا اور نہ ہی ہمیں ملا۔ یہ تو مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ بندہ آخرت میں اس کو حسرت کی نظر سے پوچھے کہ اس نے دنیا میں کچھ مانگا اور اسے محروم رکھا گیا، یہ تو ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانوں کے ساتھ ہمارے قریب ترین ہو کر آواز دیتا ہے:

''کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں''۔

تاریخ گواہ ہے اللہ نے ہمیشہ اپنے وعدوں کو پورا فرمایا۔ انسانی تاریخ تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ہر ورق کی ہر سطر میں خدا کے تکمیل وعدہ کے انمٹ ثبوت روزِ روشن کی طرح ہمیں ملتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی بے سروسامانی' پامالی اور شکستہ حالی سے کون واقف نہیں تھا لیکن فرعون کی جابر و قاہر حکومت ان کا بال بیکا نہ کر سکی۔ خود فرعون کی لاش کو خشکی پر چند فٹ زمین قبر کیلئے نہ مل سکی۔ نمرود نے آگ کا ایک مہیب الاؤ جو سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے تیار کیا تھا وہاں رب کے وعدوں نے امن وسکون کا گلشن پیدا فرمایا۔ آج نمرود اور نمرودیت کا نشان تک نہیں مگر ابراہیم علیہ السلام اور ابراہیمیت کی خاک سے سینکڑوں رسالت کے چاند نمودار ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ جن پر کوئی حکومت کرنا پسند نہیں کرتا تھا' وہ جب خدا کی ہدائت کے ساتھ اٹھے تو دنیا کی تہذیب کے کئی

ایک باب تحریر کر گئے۔ وہ جن کے قدموں پر ظلم و وحشت کی دھول جمی ہوئی تھی' خدا کی ہدائت کے بعد جہاں بھی ان کے قدم گئے خوشحالی اور امن اس جگہ کا مقدر ٹھہرا۔

آیئے! اگر واقعی آپ ارضِ وطن کو درپیش ان تمام مشکلات سے نکالنا چاہتے ہیں تو اوفو بالعہد کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے مکمل نفاذ کا اعلان کریں اور ان مصائب سے گلو خلاصی کیلیئے راہِ ہدائت کیلیئے اپنے قلوب کو دوبارہ اپنے رب کی تعلیمات سے جوڑیں۔ اپنی جبینوں کو اسی رب کے سامنے خاکستر آلودہ کریں کہ واقعی ہدائت کے خزانوں کا صرف وہی مالک ہے۔ آج ہی اپنی ذات سے اس نیک کام کا آغاز کریں 'تا کہ کل کی صبح کا سورج ہماری کامیابی کا گواہ ہو۔ ربّ کریم سے دعا ہے کہ ہمیں "ہدائت" کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین

# چلو اپنے رب کی طرف

جب کبھی ٹی وی آن کریں' کسی بھی چینل کا نمبر دبائیں' یا کوئی اخبار اٹھائیں تو ہر طرف سسکتی دم توڑتی انسانیت کے روح فرسا مناظر دکھائی دیتے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔ کہیں کسی خودکش حملے میں لاشوں کے انبار پڑے ہوئے ہیں' کہیں جنگوں میں بمباری سے ان گنت انسان موت کی آغوش میں دھکیل دیے جانے کی خبر سے دل دہل کر رہ جاتا ہے۔ کہیں قحط سے لوگ مر رہے ہیں اور کہیں سمندری یلغار یا سیلابی ریلے انسانوں کو بہا کر موت کی گمنام وادی میں اتار رہے ہیں۔ رہی سہی کسر دنیا میں ظالم و مظلوم کی کشمکش پوری کر رہی ہے۔ فلسطین کو جہاں صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے یہود کوشش کر رہا ہے وہاں کشمیر کو ہنود ہضم کر کے باقی ماندہ پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ دنیا کا ظالم تریں سرخ ریچھ روس جس کے دانت لاکھوں افغانوں کی شہادت نے کھٹے کئے وہاں اب مزید ظلم و ستم ڈھانے کیلئے قصر سفید کا فرعون قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ وہاں کے باسی پچھلے تیس سالوں سے مسلسل آج بھی مختلف خیموں میں گرمی سردی' بھوک و افلاس برداشت کر رہے ہیں۔ ہزاروں میل دور بیٹھے فرعون کو نجانے کیا سوجھی کہ عراق میں دنیا کی تباہی کے ہتھیار اس کو نظر آگئے اور اس نے آن کی آن میں عراق کی بستیوں کو ایسا تاراج کر دیا کہ اب اس کو دوبارہ اصلی حالت میں لانے کیلئے اک عمر درکار ہوگی۔

دنیا کے طول و عرض میں کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں خون کی ہولی نہ کھیلی جا رہی ہو۔ وہ اسلامی ممالک جو کہ دولت کے لحاظ سے دنیا کی غربت و افلاس ختم کر سکتے ہیں ان کے خزانوں کا استعمال بھی اغیار کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس دولت کو انسانی فلاح کی بجائے اسلحے کے بڑے بڑے کارخانوں میں کھپا کر انسانیت کی ہلاکت کا ساماں تیار کر رہے ہیں اور یہی ممالک جو کہ دنیاوی ترقی کی معراج پر ہیں آج اپنی ہی تہذیب اور سوسائٹی سے اس قدر نالاں ہیں کہ ان کی سمجھ میں اصلاح کی کوئی تدبیر نہیں آرہی' آخر یہ کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر کوئی چاہتا ہے۔ دنیا کی حیرت انگیز ترقی' دولت کی ریل پیل' حیرت انگیز وسائل رکھنے کے باوجود دنیا کے دانشور آج بے بس اور مجبور کیوں نظر آرہے ہیں' آخر کیوں؟

جب ہم اپنے اسلاف کی طرف دیکھتے ہیں تو معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں اگر تند و تیز ہوا یا آندھی چل پڑے تو لوگ دیوانہ وار مساجد کی طرف دوڑتے تھے کہ مبادا قیامت کا نزول ہونے والا ہے۔ صحابہ کرام کی پوری جماعت اس عالم میں اللہ کے حضور گڑگڑا کر اپنی مغفرت کی دعائیں کرتی تھی اور اللہ کی رحمت کی طالب ہوتی تھی۔ رحمت دو عالم ﷺ کا رخ انور بھی ان مواقع پر کبھی سفید اور کبھی پیلا ہو جاتا تھا لیکن آج زلزلوں کی تباہی، سمندروں کے طوفان' قحط کا عذاب اور خانہ جنگیوں کی تباہ کاریاں بھی ہمارے دلوں میں ذرا سی جنبش پیدا نہیں کرتیں۔

عملی زندگی میں جس طرح پولیس والے کی اچانک دستک ہمیں بدحواس کر دیتی ہے' ناکردہ گناہوں کی صفائی میں کہے جانے والے

الفاظ ہمارے ذہنوں سے سفر کر کے زبان کی نوک پر آجاتے ہیں' کیا ان تمام ناگہانی آفتوں پر جو یقیناً ہمارے اپنے ہی اعمال کی سزا ہیں' ان کی صفائی میں کہے جانے والے الفاظ کا نزول اپنے دل و دماغ پر ہوتے ہوئے دیکھا ہے ؟ اور پھر اپنی زبان سے آئندہ اعتراف کر کے تائب ہونے کی کوشش کی ہے ؟ اگر ایمانداری سے اس کا جواب تلاش کیا جائے تو یقیناً نفی میں ہو گا کیونکہ آج ہمارا دل خوفِ خدا سے خالی اور دنیا کے خوف کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں خوف ایک دل میں کبھی یکجا نہیں رہ سکتے۔ ایک خوف اندر آتا ہے تو دوسرا خوف چپکے سے نکل جاتا ہے۔ مقامِ حیرت تو یہ ہے کہ پہاڑ جیسا فرق ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا لیکن دنیاوی دولت یا عزت و حشمت میں بال برابر بھی فرق آن پڑے تو اس کا فوری نوٹس لیا جاتا ہے اور اس کیلئے پوری توانائیاں صرف کر دی جاتی ہیں۔ اس کا بھرپور علاج تلاش کر کے پھر اس پر پوری ثابت قدمی سے عمل کیا جاتا ہے لیکن صد حیف!!! روزانہ ہم قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتے ہیں' احادیث اور تاریخی اسلامی کتب بھی زیرِ مطالعہ رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود جسم کے اندر چھوٹا سا لوتھڑا (دل) جو کہ پہاڑوں کو تسخیر کرنے کی قوت رکھتا ہے اس پر قرآن و احادیث کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم میں سے بیشتر حضرات نے رسول اکرم ﷺ کا

اپنے جفاکش اور وفا کیش صحابہ سے یہ خطاب یقیناً پڑھا ہو گا کہ :

"خدائے ذوالجلال جب قیامت کے دن اپنے تخت پر براجمان ہوں گے تو آدم علیہ السلام سے کہیں گے کہ ناری گروہ کو بھیجو تو آدم علیہ السلام کہیں گے کہ خداوندا..... ناری گروہ کون ہے ؟ ارشاد ہو گا' ہزار میں سے نو سو ننانوے (۹۹۹) جہنم میں جھونکے جائیں گے اور جنت میں صرف ایک !

اس خطاب کے بعد اجتماع میں آنسوؤں اور ہچکیوں کا زلزلہ برپا ہو گیا تھا لیکن شائد ہم ان کو کوئی دوسری نسل سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ سب کچھ کر کے اس خوف سے روتے تھے کہ ہزار میں سے ایک کا بھی شرف حاصل ہو سکے گا نہیں! ان کے دلوں کو قران کی ایک آیت تہہ و بالا کر دیتی تھی' لیکن ہمارے دلوں کو پورا قرآن بھی ٹس سے مس نہیں کرتا' کتنا ہولناک فرق ہے جو آج اسلاف اور اخلاف کے دلوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہزار سمجھانے کے بعد بھی اگر یہ فرق ہماری سمجھ میں آ بھی جاتا ہے تو دل اس کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔

شقیا الاصبحی جو کہ اسلاف کی ایک نشانی ہیں' مدینے میں انسانوں کا ایک جم غفیر دیکھ کر اس معاملہ کی تہہ کی جونہی کوشش کرتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے ایک عاشق رسول ﷺ کو اپنے حصار میں لیا ہے اور حدیث سننے کی درخواست کر رہے ہیں تو جواب میں ان کے ہونٹوں اور جسم پر ایک لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور دردناک چیخ مار کر بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ تین بار کوشش کی لیکن زبان نے خوفِ خدا کی وجہ سے ساتھ نہ دیا۔ جب غشی کی حالت ختم ہو گئی تو فرمایا:

ایک ایسی حدیث سناتا ہوں جو اسی گھر میں رسول اکرم ﷺ کے منہ سے سنی تھی۔ "قیامت کے روز جب خدا بندوں کے فیصلے کیلئے اترے گا تو سب سے پہلے تین اشخاص طلب کئے جائیں گے 'ایک قاری' دوسرا دولت منداور تیسرا شہید! خدا قاری سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تجھے قرآن نہیں سکھایا' اس پر تو نے کیا عمل کیا؟ قاری جواب میں دن رات قرآن کی تلاوت کا ذکر کرے گا تو خدا اس سے فرمائے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے 'تم نے یہ سب لوگوں کیلئے کیا تاکہ تم کو قاری کہیں۔ اسی طرح دولت منداپنی سخاوت کا اور شہید اپنی جان کی قربانی کا ذکر کرے گا تو جواب میں رب ذوالجلال ان کو بھی جھوٹ سے تشبیہ دے کر دنیا کے دکھلاوے کا عمل کہے گا اور یہ کہہ کر رسول اکرم ﷺ نے میرے زانو پر ہاتھ مارا کہ اللہ تعالیٰ حکم صادر کریں گے کہ ان کو منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں دھکیل دو اور سب سے پہلے جہنم کی آگ ان پر ہی شعلہ زن ہو گی"۔

پھر جس طرح حدیث سنانے والے کی (حضرت ابوہریرہ) کی چیخیں لوگوں نے نکلتی ہوئی دیکھیں یہی عالم سارے مجمع کا ہوا۔

ہمارے اسلاف پیکر اخلاص تھے اور ہم اس سے کوسوں دور! وہ ریاکاری کے خوف اور اس کے لرزہ خیز انجام سے لرزہ براندام تھے ' ہم دنیاداری کو دین وایمان سمجھ کر بڑے اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ دنیا کے طول وعرض میں مختلف حادثات کو پڑھ کر ہم محض اس لئے مطمئن ہیں کہ ہم اس کا شکار نہیں ہوئے حالانکہ دل کی اسی بے حسی اور بدلتی ہوئی کیفیت نے تو ثابت کر دیا ہے کہ ہم جو برسوں سے انحطاط کا شکار ہیں اس کی وجہ ہمارا یہی عارضی قلبی اطمینان ہے۔ مومن اور مسلمان کے دل میں تو ایک تڑپ رہتی ہے جو اس کو ہر پل بے چین رکھتی ہے۔ دنیا میں خدا اور رسول کے احکام کی روگردانی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ اس ساری سوسائٹی و تہذیب کے دھارے کو تبدیل کرنے کی کوشش میں اپنی پوری زندگی کھپا دیتا ہے۔ لوگوں کے دلوں کو اپنے رب سے جوڑتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کو شب وروز دہراتا ہے۔ صحابہ کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر روزانہ کے اعمال کا ہر روز سونے سے پہلے محاسبہ کرتا ہے۔ اگر ہماری بھی یہ کیفیت ہو جائے تو یقین کے ساتھ یہ امید رکھی جا سکتی ہے کہ وہ سوال (جن کے جواب آج کل کے دانشور بھی) تلاش نہیں کر سکے ہمارے صالح اعمال کو دیکھ کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ ہر وز ناگہانی آفتوں کا جواب صرف اور صرف یہ ہے اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو اگر زندگی مل سکتی ہے تو صرف اسی ایک راستے پر چل کر۔ اس کیلئے ہم میں سے ہر شخص خدا کے ہاں جوابدہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اللہ کے احکام کو اس دنیا میں نافذ کرنے میں کتنا جان ومال صرف کیا؟

آیئے آج ہم سب یہ عہد کریں کہ آپس کی گروہ بندیاں 'تفرقے بازی اور فروعی اختلافات کو پس پشت ڈال کر اپنے دلوں کو خوفِ خدا سے آراستہ کریں گے تاکہ عقبیٰ وآخرت کی نجات ہو سکے۔ آمین

# امام اور چور

عباسی خلفاء کے دور میں جب بدعت و ظلم کی سیاہ وحشت ناک راتوں نے دین اسلام کے اجالے میں عظیم فتنہ،، خلق قرآن،، کے کرنے کی کوشش کی تو اس زمانے کی ظالم حکومت نے اپنے پورے قہر و جبر کے ساتھ کلمۃ الحق کہنے والوں کی زبانیں نام سے بگاڑ پیدا کاٹ کر ان کے منہ زر و جواہر سے بھرنا شروع کر دیئے۔ اپنے اقتدار کی طوالت کی خاطر رسن و دار اور فولادی زنجیروں کی بھرمار کر ڈالی اور اہل دہشت کی بناء پر خوفِ خدا کی شاہراہ کو سنسان کرنے کا ہمہ وقتی عمل شروع کر دیا۔ جہاد وغیرہ کا درس دینے والے سہمی ہوئی بھیڑوں کی طرح ایک کونے میں سر چھپائے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں عام مسلمان،، علمائ،، کو گوشہ سکوت میں سر چھپائے ہوئے دیکھ کر بڑی دلسوزی کے ساتھ اس بات کی گڑ گڑا کر دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی تو خدا کا بندہ ایسا ہو جو اس ظلم و باطل کا حق و راستی کے ساتھ مقابلہ کر سکے اور اس امت کو آخرت میں محمد عربی ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچالے!

تاریخ گواہ ہے کہ اس لرزہ خیز محاذ پر اللہ نے اپنے بندوں کی مناجات، التجائیں بہت قریب سے سنیں اور اس بستی میں سے ایک مجاہد نے اس جہاد میں کود کر اس خون آشام جابر اور ایمان کش اقتدار پر کلمۃ الحق کی ایسی بجلیاں گرائیں کہ کفر کا سارا سیاہ دامن اور بدعت و ظلمت کا پورا وجود لرزنے لگا۔ جب اس بندہ خدا نے ظلم و جبر کی آندھیوں میں حق پرستی اور حق گوئی کے چراغ اپنے لہو اور اشکوں سے جلانے شروع کئے تو ان دنیادار، ظلمتوں کے علمبرداروں نے اپنی پوری کوشش کر ڈالی کہ اس روشنی کو زر و جواہر، اقتدار اور منصب کی لالچ سے ڈھانپ کر بجھا دیا جائے لیکن "وہ" جان چکا تھا کہ اس دل میں اگر صرف ایک خوف جگہ بنالے تو دنیا کے تمام مصائب سے نجات دلا دیتا ہے۔ اس لئے اس نے "خوفِ خدا" سے اپنے دل کو مزین کر لیا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جب کوئی اور خوف اس دل میں جگہ بنانا شروع کر دے تو پہلا خوف دبے پاؤں چپکے سے نکل جاتا ہے۔ اسی لئے اس مردِ مومن نے خوفِ خدا کی ضربِ کلیمی سے خوفِ دنیا کے پرخچے اڑا دیئے۔ اس مردِ مومن کو یہ علم تھا کہ اس عمل کے بعد اس کے وجود کے پرزے اڑا دیئے جائیں گے لیکن ایمانی جوش، دنیاوی ہوش پر ہمیشہ سبقت لیجاتا ہے اور اس کے دل پر یہ پیغام پہنچ چکا تھا کہ:

یہ قدم قدم بلائیں یہ قدم کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

جاہ و اقتدار کی مکروہ پیشانی جس کی نگاہوں نے ہمیشہ اپنے سامنے سر جھکتے ہوئے دیکھے تھے، ایک مردِ حق کا باطل کے سامنے اٹھا ہوا سر دیکھا تو بیشمار بل آ گئے، نخوت و تکبر نے اس تنہا گردن و جبیں کو جھکانے کیلئے اپنی پوری طاقت کا اظہار اس طرح کیا کہ منوں وزنی لوہے کی زنجیروں میں پابجولاں کر کے شہر کی گلیوں میں گھمایا۔ موت کی ہلاکت آفرینیاں ہر وقت اس مردِ حق کے سر پر منڈلا رہی تھیں، اس وقت بھی اس عظیم الشان مردِ مجاہد کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جس نے اس کے چہرے کے بے حجاب حسن و جمال میں اس

قدر اضافہ کر دیا کہ باطل کے پروردہ منافقین اپنے چہروں کی سیاہی کو چھپانے کیلئے گھروں کے تاریک کونوں کھدروں میں چھپ گئے لیکن اس مرد حق کی عاجزی اور انکساری کا جلال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ حق کو مٹانے والے خود مٹ جاتے ہیں اور حق کی خاطر موت کو گلے لگانے والے ابدی زندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں اور رہتی دنیا تک امر ہو جاتے ہیں۔

عقوبت گاہ میں جب اس مردِ حق پر زندگی ہر طرح سے تنگ کر دی گئی، رمضان المبارک کے صبر آزما مہینے میں اس فولادی عزیمت کے پیکر پر کوڑوں کی بارش نے خون کے چھینٹے اڑانے شروع کئے اور پھر کوڑے بھی ایسے کہ ہاتھی کی پشت پر اگر برسیں تو وہ بھی بلبلا اٹھے لیکن اس عظیم شخص کے منہ سے کوئی کراہ، کوئی آہ اور نہ ہی کوئی بد دعا کے الفاظ جاری ہوئے بلکہ وہ تو ان تمام چیزوں کو اپنے درد کی توہین اور اس راستے پر چلنے کا انعام سمجھ رہا تھا۔ اگر اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی تو یہی کہ: "کتاب وسنت سے کوئی دلیل لاؤ" حالانکہ اس بھاری ابتلاء کے موقع پر جب کہ خون آشام جبڑے ان کی ہڈیوں کو چبانے کیلئے اپنی پوری قوت صرف کر چکے تھے، حاکمِ وقت نے خود ان کی عظمت کو سلام کر کے اپنی ہار ماننے کیلئے یہ تجویز رکھی کہ اس معاملے پر خاموش ہو جاؤ، اس کی اگر تائید نہیں کر سکتے تو تردید بھی نہ کرو لیکن عزیمت کے اس پیکر نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اپنی اشک آلود نگاہیں اٹھا کر اپنے رب سے فضل ورضا کی درخواست کی اور پھر زمین پر جھک کر قبر وبرزخ کی دنیا میں جھانک کر اپنی مظلومیت کے حسین ترین انجام کو دیکھ کر جب حاکمِ وقت پر نگاہ ڈالی تو اس کا سارا شاہی رعب ودبدبہ، اس کا تخت وتاج اور اس کا اپنا وجود ان نظروں کی تاب نہ لا سکا اور اس مغرور بادشاہ کا سارا وقار اس درویش کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔ وہی ظلم وقہر کا پہاڑ جس نے تمام علمائے سو کو اپنے گرد جمع کر رکھا تھا اور شرعی آڑ کی رخصت میں تمام علمائے سو کو زر وجواہر کے بدلے اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا، منت سماجت پر اتر آیا لیکن اس مردِ مومن کی ایک ہی پکار تھی کہ:

"اگر کوئی دلیل کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ سے لے آؤ تو یہ سر نہ صرف اطاعت کیلئے جھک جائے گا بلکہ قربان بھی ہو جائے گا ورنہ ہم دونوں کے راستے بالکل الگ الگ ہیں"۔

جب کوڑوں کی بارش نے جسم کی کھال ادھیڑ دی، فولادی زنجیروں نے جسم پر خونچکاں بسیرا کر لیا، بھوک وپیاس کی اذیت نے قیامت کا ساماں پیدا کر دیا تو جسم پر غشی کی حالت طاری ہو گئی۔ آنکھ کھلنے پر کچھ علمائے سو کے ہاتھوں میں ٹھنڈا پانی دیکھا جو شریعت میں اس موقع پر پانی پینے کی گنجائش بتا رہے تھے تاکہ زندگی بچ جائے لیکن عزیمت کے اس امام نے تاریخ ساز جواب دیکر "میں روزے سے ہوں اور اسی حالت میں اپنے رب سے ملنے کی خواہش وتڑپ رکھتا ہوں" پانی کے اس پیالے کو نظروں سے دور کر دینے کو کہا۔ انہی زخموں سے چور اپنے خالقِ حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور دل سے جو ہوک اٹھی کہ "شریعت میں صرف رخصت ہی نہیں عزیمت بھی ہے۔ اگر میں رخصت کی راہ پکڑ لوں تو آخر اس حدیث نبوی ﷺ پر کون عمل کرے گا کہ جس میں وضاحت کے ساتھ ختم الرسل ﷺ نے اپنے صحابہ اکرام کے مصائب کی فریاد پر فرمایا کہ:

"تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سروں پر آرے چلا دیئے گئے اور جسم لکڑی کی طرح چیر دیا گیا، لوہے کے کنگھوں سے ان کے جسم کے گوشت کو نوچ ڈالا گیا پھر بھی یہ تکالیف ان کو حق کے راستے سے نہ ہٹا سکیں"۔

وہ علماء جو شرعی رخصتوں کی آڑ لیکر اس فانی دنیا میں چند روز خیریت سے زندگی گزارنا چاہتے تھے وہ بھی اس مردِ مجاہد کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے کیونکہ ان کو علم ہو گیا تھا کہ یہ اللہ کا سچا رفیق طے کر چکا ہے کہ محض چند روزہ فانی زندگی کے مقابلے میں اخروی زندگی بدرجہا بہتر ہے۔ موت سے تو کسی کو مفر نہیں، کسی نہ کسی آرزو کا رنگ تو کفن کو رنگین کرے گا، پھر کیوں نہ راہِ حق میں استقلال کا رنگ اپنے کفن کیلئے منتخب کر لیا جائے تاکہ جب اس حالت میں فرشتے خدا کے پاس لیکر حاضر ہوں تو دور سے ہی اس کفن کے رنگ میں اللہ کی خوشنودی کا پیام موصول ہو اور خدا کی رحمت دنیا میں دیئے گئے زخموں پر والہانہ پیار کرنے کیلئے لپک کر بوسے دے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

پھر وقت نے دیکھا کہ دنیاوی لحاظ سے کمزور و ناتواں، بے سروسامان مردِ مجاہد نے اس بادشاہِ وقت کو جو کہ اپنے ہر ظلم کا ہر وار آزما چکا تھا، خدا کی نصرت کے بل بوتے پر اس کو شکست فاش دی، وہ جو اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ کرتا تھا، جس کو اپنے ہتھیاروں اور اپنے عقوبت گاہوں پر بڑا ناز تھا، جو اپنی دولت سے ہر کسی کو خریدنے کا دعویٰ کرتا تھا، اپنی فوجوں کی بہادری اور آہنی محل کے پہریداروں پر بڑا فخر کرتا تھا، موت کے فرشتے نے اس کے جسم سے اس طرح جان نکالی کہ آہنی پہریدار اور فولادی حلقے اور مضبوط در و دیوار دیکھتے رہ گئے اور وہ بے بسی کے ساتھ بڑی حسرت ناک اور عبرتناک موت کے سامنے چوں چراں نہ کر سکا۔

اس مرد حق کی زنجیریں نئی قیادت نے انتہائی عقیدت و احترام کے ساتھ نہ صرف کاٹ ڈالیں بلکہ تعظیم و تکریم کے تمام جھونکے نچھاور کر ڈالے۔ قدم قدم پر عقیدت کیشوں نے آنکھیں بچھائیں مگر عظمت کے اس پہاڑ نے فاتحانہ نہیں مگر عاجزانہ چال کے ساتھ سب سے پہلے صبر کے ابلتے ہوئے آنسوؤں اور خوشیوں کی چیخوں میں شکرانے کے جہاں نوافل ادا کئے وہاں ظالموں کیلئے راہِ ہدائت کی دعائیں کیں۔ نئی قیادت نے پرانے مظالم کا حساب دنیا میں چکانے کی کوشش کی تو اس مردِ درویش کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں کہ:

"یہ شاہی اشرفیوں کے توڑے شاہی عتاب کے کوڑوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ یہ دنیا جسے ستم سے نہ دبا سکی اب اس کو کرم سے خریدنے کی کوشش کر رہی ہے"۔

ایک طرف دین کا فتنہ تھا، دوسری طرف دنیا کا فتنہ!! شائد ان کو وہ واقعہ یاد آ گیا کہ جب دنیا بن سنور کر محمد ﷺ عربی کا دل لبھانے کیلئے آگے بڑھی تو آنحضرت ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اس کو دھکے دیکر نکال دیا تھا، دنیا نے اس وقت کہا تھا، آپ ﷺ تو مجھ سے بچ گئے لیکن آپ ﷺ کے بعد لوگ شائد ہی مجھ سے بچ سکیں"۔

یہی وجہ تھی کہ وقت کے اس عظیم امام نے شاہی نوازشات کو بھی بڑی حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ وہ حاکمِ وقت کے نہیں بلکہ حاکموں کے حاکم کے شکر گزار تھے کہ جس نے ان کی ہر مشکل میں نصرت فرمائی اور ان کے دل کو یہ توانائی بخشی کہ جسم میں سب سے چھوٹے لوتھڑے نے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اکثر تنہائی میں اپنی اور مسلمانوں کی بخشش کی دعائیں کرتے تو وہاں ایک گمنام شخص "ابو الہیثم" کی بخشش کی دعائیں بڑی رقت آمیز انداز میں کرتے۔ جب عقدہ کھلا کہ ابوالہیثم ایک چور تھا، جب اس مرد مجاہد کو پابجولاں کر کے بازاروں اور گلیوں میں رسوا کیا جا رہا تھا تو اس وقت اس چور نے بڑی دلسوزی کے ساتھ کہا کہ:

"میں ایک چور ہوں اور چوری کیلئے کم و بیش اٹھارہ سے بیس ہزار ضربیں اپنی کمر پر برداشت کر چکا ہوں، اس کے باوجود میرے ارادے ٹس سے مس نہیں ہوئے اور میری یہ ثابت قدمی دنیا جیسی ناپاک چیز کیلئے تھی۔ ہزار افسوس ہو گا تم پر اگر تم "راہِ حق" میں اتنی بھی ہمت نہ دکھا سکو"۔

چور کا یہ پیغام ان کے دل میں تیرِ حق بن کر اتر گیا اور اس پیغام نے اس مردِ حق کو اپنے وقت کا عظیم امام "احمد بن حنبل" بنا ڈالا۔ یہ اس عہد کی کہانی ہے کہ جب ایمان کی آگ سینوں میں اتنی تھی کہ چور کے چند سوز بھرے کلمات نے تاریخ کو ایک عظیم الشان مجاہد سے متعارف کروا دیا لیکن آج سینکڑوں نہیں لاکھوں زبانیں جمع ہو کر جبہ و دستار کی آڑ لیکر فلک شگاف نعرے بھی لگا رہی ہیں، اسی قرآن و سنت سے بے شمار واقعات سنا کر جذبات بھی ابھارے جا رہے ہیں، یقیناً یہ ایک نیک و صالح عمل ہے لیکن اس کے باوجود جب کبھی ایسا مشکل وقت آن پڑتا ہے تو واعظ اپنی جان بچانے کو عین فرض سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ اگر کہیں خود نمائی کے مواقع موجود ہیں تو اس میں شرکت عین ثواب، اگر کشمیر، فلسطین اور افغانستان کے عملی جہاد کا ذکر تو پھر عین جواب! تقریر کیلئے بہترین سٹیج مہیا کیا جائے تو عین عبادت لیکن یہی جبہ و دستار کے پرستار دوستوں سے عمل کی اپیل محض اس لئے کی جائے کہ مسلمان اپنے سچے قول و فعل سے بھی دنیا تسخیر کر سکتا ہے تو پھر ساری کاوشیں بیکار!!!

حصولِ اقتدار کیلئے دن رات نفاذِ اسلام کا نعرہ لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد اسلامی اقدار پر پہرہ! ملک کی معیشت کو اسلامی خدو خال پر استوار کرنے کا دعویٰ مگر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور امریکا بہادر کے احکام کا پہناوہ! جہاد افغانستان اور کشمیر کی جیتی ہوئی بازی استعمار کے کہنے پر ہار دی۔ کشمیر پچھلے تریسٹھ سالوں سے ظلم و ستم کا شکار ہے لیکن کشمیر کو فتح کرنے کے دعویدار اقوام متحدہ میں

اس مسئلے کو اٹھانے سے گریزاں ہیں۔ اگر کوئی جماعت مکمل دین حق کا نفاذ چاہتی ہے تو اس کو ملک دشمن اور بنیاد پرست کہہ کر الزامات کی بارش سے نواز دیا جاتا ہے۔ اغیار کے ساتھ ملی بھگت کر کے آج اسلام کو نظامِ عبادت کے طور پر تو قبول کیا جاتا ہے لیکن نظامِ حکومت کے طور پر اس کو نا قابل عمل سمجھ کر پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ اسلام جو کہ اخوت اور محبت کا درس دیتا ہے آج اس کے نام لیوا اور پیشوا اپنے مذموم مقاصد کیلئے تفرقہ بازی جیسی لعنت کو گلے لگا کر امت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں۔ ہمارے علماء کا آپس میں دست و گریباں ہونا، اتحاد کیلئے کی جانیوالی تمام کاوشوں کو اپنی ذاتی انا اور ذاتی مخاصمتوں کی بناء پر سبوتاژ کرنا، کہیں ایسا تو نہیں یہ دنیا کی چکا چوند اور خیرہ کر دینے والی روشنی ان کی آنکھوں کے ساتھ ان کے دل کو بھی اپنی زد میں لے چکی ہے اور اب کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا کام ان سے واپس لیا جا رہا ہے۔ (خدا نہ کرے) اور یہ کام جو اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے خطہ ارض پر نہ ہو سکا، اب اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان افغانوں اور کشمیریوں سے لے لے جنہوں نے فی الواقع جہاد کر کے دنیا کی ایک سپر طاقت کو ٹکڑے کر ڈالا اور بہت جلد دوسری سپر طاقت کی ریشہ دوانیوں کا بھی عبرتناک انجام ہو کر رہے گا کیونکہ اب وقت نے بھی اس بات کی گواہی دے دی ہے کہ:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مردِ کوہستانی

آیئے آج اپنے اسلاف کے کارناموں کی روح کو سامنے رکھ کر اپنے مستقبل کے بارے میں سوچیں کہ ہمیں دنیا و آخرت کی فلاح کیلئے کون سا راستہ اختیار کرنا ہے۔ کیا وہی راستہ وہی نظام حکومت، وہی نظام عدل جس میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے ہمیشہ ہر پہلو پر رہنمائی حاصل کی گئی اور جس کے طفیل حامل کتاب و سنت کو دنیا کو امام بنا دیا گیا یا پھر کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ سے دوری جس نے واقعی ہمیں ہر چیز سے دور کر دیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ہمیں حق پر چلنے اس پر عمل کرنے اور اس کی برملا حمائت کرنے کی توفیق نصیب فرمائے ثم آمین۔

# گر تو برا نہ مانے

پچھلے دنوں آپ کے جریدے (روزنامہ جنگ لندن) میں ہمارے ایک بھائی نے "ضیاء الحق شہید" کو آمر مطلق اور ان کے مظالم کو بڑی فراخ دلی سے نہ صرف گنوایا بلکہ حسب معمول تبرے بازی سے بھی دریغ نہ کیا اور آج کل یہ دستور چل نکلا ہے کہ جانے والے کو تمام برائیوں کی جڑ قرار دیکر اپنی سیاست کا آغاز کیا جائے اور بھلا ہو آپ کے اخبار کا کہ اس کے کالم بھی ہر چڑھتے سورج کی تعریف کیلئے ہر وقت حاضر ہوتے ہیں۔ یقیناً آپ اس کو آزادیٔ اظہار کا نام دیں گے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دیارِ کفر میں بھی اختلاف کے کچھ اصول و آداب ہوتے ہیں اور مسلمانوں کا تو شیوہ رہا ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی اصلاح کیلئے بھی اس نے تعمیری انداز اختیار کیا ہے لیکن یہاں جب سے جھوٹ کی سیاست کا رواج چل نکلا ہے ہم مسلمانوں نے خود اغیار میں اپنے بھائیوں کی رسوائیوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ ہر روز آپ کے اخبار میں پچھلی حکومت کو جی بھر کر مطعون کیا جاتا ہے۔ جی بھر کر اس کو گالیاں اور کوسنے دیئے جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ لوگوں کا حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ "شہید جمہوریت" کے زمانے کے کارہائے نمایاں لوگ فراموش کر چکے ہیں حالانکہ یہ سچ نہیں ہے کیونکہ مکمل سچ کے اظہار میں ایسی کچھ ناگفتنیاں آئیں گی کہ موجودہ حکومت اور ان کے حواری شائد ٹھنڈے پیٹ برداشت نہ کر سکیں۔

اگر اس بات کا یقین کر لیں کہ ایوب خان اور یحیٰی خان کی آمریت کے بعد وطن عزیز کو حقیقی جمہوریت کا "دورِ بہار" ملا تھا تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ لوگوں کا جم غفیر بھٹو مرحوم کے خلاف سڑکوں پر کیوں نکل آیا اور قومی اتحاد کی تحریک میں رسوائے زمانہ ایف ایس ایف کے ہاتھوں ہزاروں آدمیوں کو کیوں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں ضیاء الحق جیسے آمر نے جب ملک کی بھاگ ڈور سنبھالی تو لوگوں نے نہ صرف مٹھائیاں بانٹیں بلکہ خوش دلی سے اس کو قبول بھی کیا۔ پھر اس آمر مطلق کے دور حکومت میں کیوں نہ کسی کی سرِ بازار پگڑی اچھالی گئی اور اس کی حکومت کے خاتمے پر عوام نے نہ صرف ملک کے طول و عرض میں بلکہ دنیا کے تقریباً تمام اسلامی ممالک میں کیوں محبت والفت کے جذبے کے ساتھ اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی؟ اسلام آباد میں لاکھوں لوگوں کے جم غفیر کو دیکھ کر جاج شلز اور دوسرے غیر ملکی سربراہوں نے مخالفت کے باوجود اپنے اپنے ملکوں کی انٹیلی جنس کو کیوں کوسا؟ پھر اس آمر اعظم کی میت کو کندھا دینے کیلئے کیوں مخالفین بھی اپنی سعادت سمجھ کر آنسوؤں کا نذرانہ دے رہے تھے۔ پچھلے آمروں (ایوب خان اور یحیٰی خان) کے جنازے اس طرح کیوں نہ اٹھے؟

پھر ایسا کیوں ہے کہ "شہید جمہوریت" کے مظالم اور فرعونیت کی کہانیاں آج بھی لوگوں کی ذہنوں میں نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ ان کے بہت ہی قریبی معتمد بھی اس ظلم سے نہ بچ سکے۔ اگر معراج خان کو جہاں محبت کا یہ صلہ ملا کہ اپنی ایک آنکھ کے نور سے محروم ہونا پڑا وہاں جے اے رحیم جیسے بزرگ اور مخلص ساتھی کے منہ پر بھری محفل میں طمانچہ مار دیا گیا اور وہ اپنی اس عزت افزائی پر کئی ماہ

گھر سے نہ نکل سکے اور مختار رانا تو شہید جمہوریت کے جمہوری دور کے پہلے اسیر ہوئے اور پانچ سال جیل کی یاترا کے بعد برطانیہ جیسے جمہوری ملک میں جمہوریت کے آداب سیکھنے کیلئے بھیج دیا گیا لیکن اس کے مقابلے میں آمر مطلق کی انکساری، اخلاق و محبت کے مظاہرے آج بھی لوگوں کی حسین یادوں کا ایک سرمایہ بن گئے ہیں اور پھر یہ آمر اعظم عوام کے مخالفانہ مظاہروں اور مردہ باد کی گونج میں اقتدار سے رخصت نہیں ہوا بلکہ لاکھوں لوگوں کی آہوں، سسکیوں میں ایک سازش کے تحت رخصت ہوا اور آج کی جمہوریت میں تو اس حادثے کی تحقیقات بھی روک دی گئی ہیں۔

آمر اعظم کے مظالم میں کوڑوں کی سزا کا ذکر ہر دوست سر فہرست رکھ کر دوسرے مظالم کو اس کے مقابلے میں کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر شہید جمہوریت کی "نتھ فورس" اور ایف ایس ایف کے ٹارچر سیل تو برسوں لوگ اپنے ذہنوں سے محو نہ کر سکیں گے جن سے ہزاروں شہریوں نے استفادہ کیا اور بعض تو جان جان آفریں کے سپرد کر کے شہید جمہوریت کو بھرپور خراج تحسین پیش کرتے ہوئے دنیا سے اس طرح رخصت ہو گئے کہ آج تک ان کا نام و نشاں باقی نہیں، بعض آج بھی عمر بھر کی معذوری کی سند لیکر شہید جمہوریت کیلئے دن رات دعا گو ہیں۔ کیا کوڑوں کی سزا گولیوں کے نذرانے سے زیادہ ظلم کا پیام لے کر آئی تھی؟

آج آمر اعظم کے زندانوں کا بڑا ذکر بڑے زور و شور سے کیا جاتا ہے مگر دلائی کیمپوں اور شاہی قلعہ کے عقوبت خانوں کو کیوں فراموش کر دیا گیا جہاں کے اینٹ و پتھر آج بھی زبان حال سے ان تمام کرم فرمائیوں کا ذکر اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہیں اور اس وقت کے منتظر ہیں کہ انسان کے منہ پر خاموشی کی مہر لگا دی جائے گی اور تمام اعمال نامہ آنکھوں کے سامنے دہرا دیا جائے گا۔ بہر کیف افسوس سے دوبارہ دنیا میں واپسی کی خدائے برتر سے گزارش کی جائے گی لیکن ایسا ممکن نہ ہو گا۔

پھر آمر مطلق پر کوڑوں کے بل پر حکومت کرنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ جب سینہ کھول کر شہید جمہوریت کی گولیوں کے تحائف اپنی جھولی میں سمیٹ رہے تھے آمر مطلق کے کوڑوں سے کیوں دبک کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئے؟ پھر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ "شہید جمہوریت" آٹھ سال تک ایک آمر ایوب خان کی حکومت کا خدمت گار رہے اور پھر مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کی سربراہی میں لڑی جانے والی جمہوریت کی اصل جنگ میں آمر مطلق ایوب خان کے چیف پولنگ ایجنٹ کا فریضہ سرانجام دینے کا سنہری موقع بھی انہی کے حصے میں آیا۔ دوسرے آمر مطلق یحییٰ خان کا وزیر خارجہ کون تھا جس نے پولینڈ کی قرارداد کے پرزے اڑا کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو یقینی بنا دیا؟ آمر اعظم کے مارشل لاؤں کا تذکرہ کرتے وقت ہمارے دوست اس حقیقت سے کیسے انکار کریں گے کہ شہید جمہوریت نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز مارشل لاء کی کابینہ کے ایک وزیر کی حیثیت سے کیا تھا اور اسی آمر مطلق کو راولپنڈی میں کنونشن لیگ کے سالانہ اجتماع میں "امیر المومنین" کا خطاب کس نے دیا تھا؟ پھر یہ بات تحریر کرتے ہوئے بھی بالکل شرمانا نہیں چاہئے کہ شہید جمہوریت نے سول مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا تاج پہن کر ہی ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور اپنے اقتدار مطلق کا آغاز ان تمام غداروں کو جنہوں نے پاکستان کو دولخت کیا تھا، پناہ دے کر کیا۔ آخر وہ کون سی چیز مانع

تھی جوان تمام غداروں کو گولی سے اڑا دینے میں مانع تھی، لیکن شہید جمہوریت کی زلف کے اسیر پھر بھی ملک میں اپنے اعزازات کے ساتھ نہ صرف دفن ہوئے بلکہ تمام مراعات سے ان کی اولاد آج بھی استفادہ کر رہی ہے۔

پھر تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اقتدار کے خاتمے کیلئے عوامی مظاہروں پر دل کھول کر آنسو گیس کے شیل ہی نہیں بلکہ ایف ایس ر ایف اور مقامی پولیس کو اسی آمر مطلق سے گولیوں کی بھیک مانگنا پڑی اور صرف معاملہ یہی تک محدود رہتا تو بات تھی، لاہور میں مارشل لاء کس کے احکام سے نافذ ہوا؟ جتنی خونریزی شہید جمہوریت کے دور میں ہوئی کیا ایسی ہی مثال اس آمر مطلق کے دور میں کہیں ملتی ہے؟ ڈیرہ غازی خان کے فرشتہ صفت ڈاکٹر نذیر شہید کو دن دیہاڑے کس نے جمہوریت کے جام سے سیراب کیا؟ خواجہ رفیق کو دن دیہاڑے اسمبلی کے سامنے جمہوریت کا تحفہ کس نے دیا؟ سمن آباد کالج سے دو نوجوان لڑکیوں کو گورنر ہاؤس کی زینت کس نے بنایا؟ مال روڈ لاہور، اسلام آباد کی سڑکوں پر کھلے عام شراب کی بوتلیں لہرا کر اسلام کا مذاق کس نے اڑایا؟ سندھ ہاؤس میں شہناز کے لئے ممتاز بھٹو سے لڑائی کس نے مول لی اور اسی دن اس کو سندھ کی گورنری سے برطرف کیوں کیا گیا؟ حسنہ شیخ کا نام کس سے منسوب ہوا؟ ان بے شمار سوالات کا جواب اگر ایمانداری سے میرے دوست اپنے ضمیر سے پوچھیں تو میرا خیال ہے کہ شہید جمہوریت کی تصویر ہی ابھر کر سامنے آئے گی جبکہ آمر مطلق کا سال میں کئی دفعہ کعبے کی چوکھٹ اور مدینہ منورہ میں رسول اکرم ﷺ کی جالیوں سے چمٹ کر آہ و زاری تو کسی اور تصویر کا رخ پیش کرتی ہے۔

شہید جمہوریت کے وارثان جہاں آج خزانے کے خالی ہونے کا واویلا کر کے ملک کے غریبوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں وہاں آصف زرداری کو نواب شاہ میں شوگر ملز کیلئے بغیر کسی ضمانت کے پچاس کروڑ پچاس لاکھ کا قرضہ عنائت کر دیا گیا ہے۔ اپنے سسر محترم حاکم علی زرداری کو تقریباً دو ارب کے قرضوں سے مستفیذ کیا گیا اور پھر وزیروں مشیروں کی فوج کو بھرتی کر کے ملک کے خزانے پر احسان کر دیا گیا ہے۔ آمر مطلق کو امریکا کا ایجنٹ کہتے ہوئے جو زبان نہ تھکتی تھی، آج امریکا کے دورے میں پاکستان کی تاریخ پر جو لیکچر ارشاد فرمائے گئے ہیں اور امریکا بہادر کے نامحرموں کے ساتھ عروسی جوڑے میں ہاتھ ملا کر اسلامی تہذیب کا جس طرح نام روشن کیا گیا ہے اس کی مثال بھی شائد آمر مطلق کے دور میں نہیں ملتی۔ امریکا میں پاک چین دوستی اور مشرقِ وسطیٰ کے سلسلے میں جو مجرمانہ خاموشی محض اس

لئے اختیار کی گئی کہ امریکا بہادر آج کل چین سے ناراض ہے اور مربی سولار ز عربوں کی بات سننا گوارہ نہیں کرتے۔

روس پر چند منٹ برس کر امریکا سرکار کی جہاں آشیر باد حاصل کی وہاں روس و امریکا کی ملی بھگت کا شکار ہو کر افغان پالیسی کا رخ موڑ دیا۔ازلی دشمن بھارت کی خوشنودی کے لئے فوج کے بجٹ میں شرمناک کمی کر دی اور ملک کے تمام قومی سلامتی کے حساس رازوں سے اپنے وزیر داخلہ کی توسط سے بھارت کو مطلع کر کے ملک کو شرمناک حد تک رسوائی کے گڑھے میں دھکیل دیا جب کہ آمر مطلق نے دنیا کی ایک سپر طاقت کے سامنے افغان مجاہدین کی شکل میں ایسا سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کر دی کہ اس سپر طاقت کو نہ صرف ذلیل و رسوا ہو کر وہاں سے نکلنا پڑا بلکہ اسی کی کوکھ سے چھ اسلامی ملکوں نے مزید جنم لیا اور دنیا کی تمام آزادی کی تحریکوں کو ایک نئی زندگی مل گئی جب کہ وارثان شہید جمہوریت نے اپنی غلط پالیسی سے جلال آباد میں مجاہدین کا ناقابل تلافی نقصان کر ڈالا اور مجاہدین کی منزل کو تھوڑا اور دور کر دیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود بھی اگر میرے سادہ لوح دوست اس آمر مطلق پر تبرا بازی کرتے ہیں تو اس حدیث نبوی ﷺ کو اپنے ذہن میں رکھ لیں کہ مخبر صادق ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ :"حادثے کی موت شہادت ہے":

مجھے امید ہے کہ آئندہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے تاریخ کی گواہی ضرور حاصل کی جائے گی اور اگر آئینے میں اپنا ہی داغ دار چہرہ نظر آیا تو برا نہیں منائیں گے۔

# روشنیوں کا شہر

"کراچی میں دہشت گردی، ۲۴ افراد ہلاک، دولڑکوں کو سفاکی سے قتل کر کے پیٹ چاک کر دیئے گئے، ۳ عورتیں ہلاک، پولیس افسر کا قتل، ہیڈ کانسٹیبل فائرنگ سے ہلاک، پولیس کی بکتر گاڑی پر شدید فائرنگ، چار افراد کی بوری بند لاشیں، دو نوجوانوں کی برہنہ لاشیں، پولیس مقابلے میں چار افراد ہلاک........الامان الحفیظ!

یہ صرف ایک دن کے اخبار میں پہلے صفحہ کی سرخیاں اور صرف سندھ کے ایک شہر کراچی کے مخصوص علاقوں میں قتل وغارت گری کی ایک بھیانک اور دہشت ناک تصویر ہے۔ یہ صرف ایک دن کی اتفاقی خبریں نہیں بلکہ اب تو ہر روز اس قسم کی شرمناک اور دردناک خبریں پہلے صفحے کی جلی سرخیوں میں پڑھنے کو ملتی ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں جب درجن بھر انسانی جانیں اور معصوم عصمتیں ہمارے ہی ہاتھوں پامال نہیں ہوتیں۔ ہر روز اس قسم کی خبروں سے ملک کے تمام اخبارات بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

اب تو پچھلے ڈھائی سال سے مسلسل ہر روز قیامت کا منظر دہرایا جارہا ہے اور نگاہیں ایسی خبریں پڑھ کر دل تھام کر رہ جاتی ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اگر کہیں قتل ہو جاتا تو بڑے تعجب کے ساتھ اس غیر معمولی واقعے کو موضوع گفتگو بنا کر توبہ واستغفار کیا جاتا تھا مگر اب آئے دن ان خبروں نے ایسا بے حس کر دیا ہے کہ ان کو غیروں کے سر تھوپ کر خود کو بری الذمہ قرار دیکر اپنے ضمیر کا دلاسہ اور تسلی دے کر دوبارہ سلا دیا جاتا ہے۔

اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کبھی غیر مسلموں نے مسلمانوں کی قوت کو پارہ پارہ کیا ہے انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان صوبائی، لسانی، نسل و رنگ اور علاقائی فتنوں کو پھیلا کر اپنے مقاصد حاصل کئے ہیں۔ سقوط "مشرقی پاکستان" کا المیہ ابھی کل کی بات ہے۔ وہاں بھی انہی فتنوں کو ہوا دے کر مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت پر ایسا کاری وار کیا گیا کہ امت مسلمہ ابھی تک ندامت کے ساتھ اپنے زخموں کو چاٹ رہی ہے حالانکہ یہی قوم ۱۹۴۷ء میں پورے عالم اسلام کو متحد کرنے کے لئے سروں پر کفن باندھ کر اٹھی تھی مگر آج اپنے ہی گھر کی شکست وریخت کو دیکھ کر بدحواس ہو کر اغیار کی طرف دیکھ رہی ہے۔ ہمارے ازلی دشمن تو پہلے ہی ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کیلئے اپنی تمام تر قوتیں صرف کر کے اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خاکم بدہن دنیا کے نقشے سے اس پاک سرزمین کا نام مٹ جائے۔

مسلمانوں کو کھلم کھلا تعصب کے نام پر اپنے مقاصد کیلئے آلہ کار بنانا بہت مشکل ہے اسی لئے دشمنوں نے پھر وہی طریقہ استعمال کیا ہے جو کبھی اندلس اور غرناطہ میں استعمال کیا تھا جس کی تحقیق کے لئے کشمیری پنڈت "ڈی پی دھر" کئی ماہ اسپین میں رہ کر ان حالات کا مطالعہ کرتا رہا اور پھر بعد میں دنیا بھر کی تمام بدنام زمانہ خفیہ ایجنسیوں کے اشتراک سے ہمارے ایک بازو کو ہم سے کاٹ دیا اور اس کے بعد طے کر لیا گیا کہ باقی ماندہ ملک میں بھی اپنے کارندوں کے ذریعے اس عمل کو جاری وساری رکھا جائے گا جب تک پورے

مقاصد حاصل نہ کر لئے جائیں۔اس لئے کراچی میں اب خون و آگ کی جو ہولی کھیلی جارہی ہے بد قسمتی سے ہمارے ہی بھائی بندوں کو آلہ کار بنا کر ہمارے ملی وجود کو نیست و نابود کرنے کی سازش کو بڑی تیزی سے آگے بڑھایا جارہا ہے۔ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ خود ہی ایک طبقے سے قتل وخون جیسا ظلم کرواکے ،اسی کو مظلوم بنا کر منافرت کی آگ بھڑکائی جارہی ہے اور اب منافرت کی یہ آگ اس قدر بھڑک چکی ہے کہ اب اس کو بجھانے کے لئے کوئی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہو رہی۔

عصبیت کا یہ رجحان اس خطے کے عوام کا اصلی اور فطری جذبہ ہر گز نہیں ہے۔نصف صدی قبل پوری دنیا کھلی آنکھوں سے قیامِ پاکستان کے موقع پر اس بات کا مشاہدہ کر چکی ہے کہ مقامی لوگوں نے کس کشادہ دلی، خندہ پیشانی اور محبت واخوت کے ساتھ مہاجرین کو گلے لگایا تھا اور تقریباً چار دہائیاں باہمی محبت اور خوشگواری میں گزر گئیں۔مقامی اور مہاجرین کے رشتے ناطوں نے تمام جھگڑوں کو تقریباً ختم کر دیا تھا اور اس شہر کو عروس البلاد بنا کر ملک بھر سے آئے ہوئے تمام علاقوں کے لوگوں نے اس کی خوبصورتی اور حرمت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی لیکن بد قسمتی سے اس وطن عزیز کو شروع سے لیکر آج تک کوئی مخلص اور محب وطن حکمران نہ مل سکے جس کی بناء پر آج یہ نوبت آگئی ہے کہ تمام محب وطن شب وروز وطن کی سلامتی کے لئے اپنے رب کے حضور گڑ گڑا کر دعائیں مانگ رہے ہیں۔

ملک عزیز کے سادہ لوح لوگوں کو دشمنوں کی چالوں نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ اب وہ ہر خوش آواز نعرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔وہ دشمن کی اس چال کو سمجھ نہیں سکے کہ لڑائی مقامی اور مہاجر کے درمیان نہیں بلکہ ظلم اور انصاف کے درمیان ہے، بد دیانتی اور دیانت داری کے درمیان ہے ، حقوق کے حصول اور عدم حقوق کے درمیان ہے، خدا کے خوف اور آخرت کی فکر سے بے نیاز سیاست دانوں، حکمرانوں اور عوام کے درمیان ہے ۔جب تک ملک میں ایسے ظالم اور بد کردار لوگ حکمران طبقہ اور سیاست دانوں میں موجود رہیں گے اس ملک میں خیر اور فلاح کا کوئی کام نہ ہو سکے گا ۔پچھلی نصف صدی عوام کو اسلام، نظریہ پاکستان، قومی اتحاد، نظام مصطفی کے نفاذ کے نام پر جو دھوکے دیئے گئے ہیں اس کی وجہ سے آج اسلامی وحدت کے خالی وعظ سنا کر اس عصبیت کی تحریک کو اب ٹھنڈا کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے اس لئے جب تک عوام کی بنیادی شکایات کا ازالہ کر کے انہیں عدل وانصاف کا عملی یقین نہیں دلایا جائے گا اس وقت تک مفسد عناصر حقوق کے نام پر تعصب کے جذبات کو ہوا دیتے رہیں گے اور یہ رویہ بالآخر ملک وملت کی تباہی کا باعث بن کر رہے گا۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ سندھ کے بالخصوص اور ملک بھر کے بالعموم بااثر، سنجیدہ، درد مند اور محب وطن سر جوڑ کر ایسی

امن کمیٹیاں بنائیں جو مثبت طور پر باہمی اخوت و محبت، یکجہتی اور تعاون کی فضا پیدا کریں اور ایسا ماحول پیدا کریں کہ مقامی حضرات مہاجروں کے اور مہاجر قوم مقامی حضرات کے حقوق کیلیئے آواز اٹھائیں نہ کہ آج جس طرح مہاجر ایم کیو ایم کی شکل میں ۱۸ نکات پر مشتمل اپنے مطالبات منوانے کیلیئے موجودہ حکومت سے بات چیت کر رہی ہے اور حکومت جواب میں ۲۱ نکات کی فہرست ایم کیو ایم سے بزور طاقت منوانے میں مصروف ہے۔اس میں شک نہیں کہ ایم کیو ایم کے نکات نمبر ۳/۴/۹/۱۰/۱۳/اور نمبر ۱۱ کا پہلا حصہ غیر ضروری ہیں اور معاملات سلجھانے میں رکاوٹ ثابت ہو سکتے ہیں۔اسی طرح حکومت کے نکات ۶/۱۷/اور ۲۰ مذاکرات کی ناکامی کا سبب بن سکتے ہیں۔ویسے بھی ملک کی سلامتی کے لئے حکومت کو کشادہ دلی کا اظہار کرتے ہوئے معمولی مطالبوں کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیئے۔

ایک طرف ملک کی وزیر اعظم جائز مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کرتی ہیں، دوسری طرف ان کی حکومت کے وزیر داخلہ ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے مذاکرات کو ناکام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت فی الفور اپنے وزاراء کو سختی کے ساتھ اس بات کا پابند کرے کہ وہ کشادہ دلی کے ساتھ اپوزیشن کے تمام سیاستدانوں کا احترام کریں، کسی بھی قسم کی الزام تراشی سے اجتناب کریں۔ حکومت نے جو پہلی دفعہ اپنے تمام سیاسی ارکان کو جو دہشت گردی اور دوسرے خطرناک الزامات کے مقدمات میں ملوث تھے بری کر دیا تھا، اب ایسی ہی تحریک دوبارہ چلا کر ایم کیو ایم کے بے گناہ لوگوں کو رہا کرنا چاہیئے۔اسی طرح ایم کیو ایم کی حب الوطنی کا تقاضہ ہے کہ ہندوستان جیسے مکار دشمن کے بے گناہ کشمیریوں پر مظالم توڑے جانے پر کھلم کھلا مذمت کرے اور یہ بات علی الاعلان واضح کرے کہ ہم مکار دشمن کی ہر چال کو ناکام بنا دیں گے۔اس طریقے سے امید ہے کہ انشاء اللہ پھر وہی محبت اور اخوت کی فضا لوٹ آئے گی جس کا دلکش نظارہ قیام پاکستان کے وقت ہوا تھا۔

# نشانِ راہ

"ایک مدت کے بعد آپ کی شگفتہ و فکر انگیز تحریر پڑھنے کو ملی۔ مجھے آپ سے یہی گماں تھا کہ وہ ہاتھ جو برسوں سے انسان کے اجسام کا پوسٹ مارٹم کر رہا ہو، وہ ہاتھ جو قصابوں جیسا کام کر کے انسانوں کو راحت پہنچا رہا ہے یقیناً ایک دن انسان کی روح کی آسودگی کیلئے اس سے بڑھ کر کسی اعلیٰ اور ارفع مقاصد کیلئے اپنی ندگی کا رخ متعین کرے گا۔ الحمدللہ آپ نے بروقت مستحسن قدم اٹھایا اور یہ وقت کی ضرورت بھی تھی حالانکہ کویت میں کئی دفعہ ان معاملات پر آپ سے بحث بھی ہوئی تھی، بحث میں کتنی ہی باتیں، کتنی ہی الجھنیں اور کتنے ہی مسائل بیان ہوتے تھے۔ اس بحث میں ہم دونوں اپنے دل دماغ کی کتنی ہی تصویریں بلکہ تصویروں کا پورا البم ایک دوسرے کے حوالے کر دیتے تھے، پھر ہر تصویر کے ہر پہلو پر بامقصد بات ہوتی تھی لیکن وسائل اور افرادی قوت پر آکر ہمیں یہ تمام تصویریں نامکمل اور ادھوری نظر آتی تھیں اور ہم جو ایک دوسرے کے ساتھ بہت فلسفیانہ باتیں کرتے تھکتے نہیں تھے، رنج والم کی بہت سے داستانیں اشاروں میں بیان کرتے تھے، اپنے ہی فلسفے سے شکست کھا کر اگلے دن کیلئے تیاری کرتے تھے کیونکہ یہ سارا اندازِ فکر ایک خالص رضائے الٰہی کے حصول کیلئے ہوتا تھا، اس لئے ناامیدی قریب بھی نہیں پھٹکتی تھی کیونکہ اس بات کا ہم دونوں کو علم تھا کہ مہلتِ زندگی پرچہ دینے کا وقت ہے، دنیا کمرۂ امتحان ہے، مالکِ کائنات خود ممتحن ہے اور نفاذِ اسلام کا نصب العین پرچہ امتحان ہے اور یہ پرچہ مومن کے ایمان کی کسوٹی ہے نہ کہ اس کا قیام مطلوبِ مشیت ہے۔ لیکن اس خطے میں آپ نے جہاں انداز فکر میں تبدیلی پیدا کی ہے وہاں آپ نے مجھے مغرب کی آسائش زدہ زندگی سے تائب ہونے کی تلقین کرتے ہوئے واپس آنے کی نصیحت فرمائی ہے۔

یہاں مجھے معمولی سا اختلاف کرنے کی اجازت دیں۔ آپ بھی کویت آمد سے پہلے کشمیر سے دہلی کی طرف تشریف لائے تھے جو کہ ہندوستان کا مغرب کی طرف کھلنے والا دروازہ ہے، جس طرح پاکستان کا شہر کراچی مغربی تہذیب کے داخلے کا سب سے پہلا مستقر ہے۔ بلاشبہ ہمارا قبلہ بھی مغرب کی طرف ہے اور ان لوگوں کا بھی جو،، مغرب،، کے پجاری ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ ہم "رب المغربین" کی عطا کردہ تہذیب کے پیروکار ہیں اور وہاں کے بسنے والوں کی اکثریت مغربی تہذیب کی گرویدہ ہے۔ اس مغرب کی جہاں سائنس نے مشینیں بنا بنا کر افکار و خیالات کی سادہ فضا کو دھواں دار کر رکھا ہے۔ اب یورپ سے جو بھی جہاز جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا جس قدر گندہ مال درآمد کر کے لاتا ہے بلند آشیاں لوگ سب سے پہلے اس میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں اور اس درآمد کی ہر کھیپ میں کچھ نہ کچھ نیا مال آ ہی جاتا ہے۔ دین و مذہب کی طرف شکوک و شبہات، ریب و تذبذب کا طرزِ عمل، ظاہری چمک دمک پر جان دینا معاشرتی زندگی میں مختلف حدود و قیود سے بیزاری، مذہب سے جان چھڑانے کا رجحان، عورتوں کی مساوات کا بناوٹی اور نظر فریب نعرہ! غرضیکہ کیا کچھ ہے جو مغرب (یورپ و امریکا) سے برآمد ہو کر دہلی و کراچی پہنچتا ہے۔

اس سارے انبار ژولیدگی میں جو دل و دماغ ہیں کانٹے چبھ جاتے ہیں، اب اس سے پہلے کہ یہ کانٹے نکلیں اور زخم مندمل ہو کر قلب

و نظر کی صحت بحال ہو کچھ دوسرے کانٹے آکر دل و دماغ کو مجروح کر دیتے ہیں اور ایک سخت عذاب تشکیک میں مبتلا کر دیتے ہیں اور یہ سارا مشاہدہ شدت سے ارضِ مملکتِ خداداد میں پچھلی دو دہائیوں سے دیکھنے کو کچھ زیادہ ہی مل رہا ہے۔ مسلمان عورت جس کا طرۂ عظمت عصمت و حیا تھا، اب بازاروں میں ولائتی سامان نمائش کی طرح بے باکی و بے حجابی کا اشتہار بن کر گھس آئی ہے۔ فیشن شو کے نام پر کیٹ واک کے اجتماعات میں ہوس بھری نظریں کھلے عام اپنی پسند و ناپسند کا پروانہ جاری کر کے اپنی راتوں کو رنگین بنانے کا ذریعہ بن چکی ہیں۔ جن بازاروں کو حضور اکرم ﷺ نے شیطان کی گزر گاہیں قرار دیا تھا، وہ بازار اب نمائش کی گیلریاں بن گئے ہیں۔ جن اخباروں میں کبھی مسلمان عورت کی تصویر نہیں دیکھی تھی اب نہ صرف اخبارات بلکہ الیکٹرانک میڈیا میں ہر چند منٹ بعد ان میں حیا فروش تاجروں کی تیار کردہ کریموں کے اشتہارات چند ٹکوں کی خاطر ان الفاظ میں شائع اور نشر ہوتے ہیں کہ "برقعہ پہننا کالے پن کو چھپانے کی علامت ہے"۔

ثقافت کے لفظ کو عریانی، مے خواری، بے حیائی اور ناچ رنگ کے مفہوم میں لیا جا رہا ہے اور حکومت خداداد پاکستان ثقافت کے نام پر بڑی بڑی آرٹ کونسلوں پر اس غریب اور مظلوم قوم کا لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں روپیہ صرف کر رہی ہے بلکہ حکومت پاکستان کے کئی عہدیداروں ترنگ میں آکر اعلان کرتے ہیں کہ یہ اسلامی مملکت کی آرٹس کونسلیں اپنے پروگرامز کے ذریعے ملک میں قہر خداوندی سے جو زلزلے اور سیلاب سے متاثرین کی امداد کر رہی ہیں۔ الاامان الحفیظ! خدا کے غضب کو مزید بھڑکانے کی کھلے عام دعوت دے رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں اسلامی مدرسے میں جب صبح سویرے اسمبلی ہوتی تھی تو تمام امت مسلمہ کیلئے بالعموم اور پاکستان کیلئے بالخصوص دعائے خیر بھی ہوتی تھی اور ہر روز کوئی نہ کوئی استاد کسی اسلامی موضوع پر خطاب بھی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اسکول کے فارغ التحصیل طلباء میں دوسرے اسکولوں کے طلباء کی نسبت اسلامی محبت و اخوت کچھ زیادہ ہوتی تھی اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی میں بے خوفی اور بیباکی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کا عملی تجربہ کویت میں ہوا جب میں اور آپ ایران کے انقلاب سے متاثر ہو کر ان کی پہلی انقلابی سالگرہ میں شمولیت کیلئے دوستوں کی شدید مخالفت کے باوجود روانہ ہو گئے تھے۔ واپسی پر کویت کے ائیرپورٹ پر ہی پاسپورٹ ضبط کر لئے گئے تھے۔ یہ تو کبھی سوچا نہ تھا کہ کویت کے جس جدید ہوائی اڈے کی تعمیر کی نگرانی میرے ذمہ تھی، چند سال بعد اس کے ایک حصے حوالات میں مجھے آپ کی معیت میں اس حال میں چند گھنٹے بھی گزارنے ہونگے۔ کچھ گھنٹے سلاخوں کے پیچھے جانے کی سنت یوسفی اور اسوۂ حنبلی کی ادائیگی کا بھی بھرپور موقع ملا۔ بالآخر ہماری بے گناہی ہمارا اجرم قرار پائی اور یہ قید و بند کے چند گھنٹے از راہِ لطف ہمارے کھاتے میں محض اس لئے ڈال دیئے گئے کہ افسر مجاز دوپہر کے کھانے کے بعد اپنی ڈیوٹی کے دوران ہی قیلولہ فرما رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کیوں بند کر دیئے گئے؟ اربابِ اقتدار خوش کہ طاقت کا نشہ ابھی ہمیں ان کے پاؤں پکڑنے پر مجبور کر دے گا لیکن بھلا ہو ان چند دوستوں کا جو ہماری خاطر پھر قربانی دینے کیلئے موقع پر آن دھمکے اور وہ جو اللہ کو بھی بطور ضامن

مانے کو تیار نہیں تھے اپنے ہی کویتی بھائیوں پر احسان کر کے ہمیں مستقبل میں تائب و تابعدار رہنے کا فیصلہ سناتے ہوئے اگلے دن کیلئے سی آئی ڈی کے دفتر میں حاضری کے پروانہ پر دستخط کروا کر احسان جتا رہے تھے۔

بات اگر یہاں تک ہی موقوف ہوتی کہ پھولوں سے محروم کر دیتے لیکن جب کانٹوں پر سے بھی حق چھین لیا گیا تو غیرتِ ایمانی کا تقاضہ یہی تھا کہ اس رزق سے منہ موڑ لیا جائے جو پرواز میں کوتاہی پیدا کر رہا ہے ۔ایک غیر مسلم اور وہ بھی ہندو جو کل تک میرا ماتحت تھا اس کو فوری طور پر مجھ پر ترقی دیکر اس کے ماتحت کام کرنے کا حکم صادر کر دیا گیا۔ گویا مجھ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ گویا تذلیل و تکذیب کا دور اب شروع ہوا چاہتا ہے اور میرے احتجاج اور بیباکی نے جو مجھے بچپن میں اسکول میں ملا تھا، عجب تماشہ کھڑا کر دیا۔ مجھے انتہائی معذرت اور افسوس کے ساتھ یہ تاثر دیا گیا کہ "اوپر والوں" کا منشاء یہی ہے کہ کچھ ہفتوں تک اس سلسلے کو برداشت کرنا پڑے گا حالانکہ میں تو،، بہت اوپر والے،، ہی کی بندگی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اپنے کام کی اغلاط اور الزامات کے بارے میں دریافت کیا، ان کے سامنے ماضی کے واقعات جن میں ٹھیکیداروں کے انعامات کو ٹھکرانے کا سب کو علم تھا، سالوں کی کمائی دنوں میں حقارت سے ٹھکرا دینے سے سبھی آگاہ تھے لیکن انہوں نے شائد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ میرے بچوں کو محض اس لئے محرومی و افلاس کا شکار بنانا چاہتے ہیں کہ میں اس مملکت کی خدمت کو بھی عبادت سمجھتا ہوں۔ اسی لئے یہ خطہ میرے نزدیک ایک مسجد کی مانند مقدس ہے لیکن "اوپر والوں" نے کچھ نہ سنا اور مجھے جبراً اسی عہدے پر کام کرنے کو کہا گیا اور میرے انکار پر مجھ کو الگ کرنے کی دھمکی سنا دی گئی۔ اس سے پیشتر کہ ان کے چہروں پر باطل کی مسکراہٹ آتی میں نے اپنا استعفیٰ خود تحریر کر کے ان کے منہ پر دے مارا اور اس میں صاف لکھ دیا:

"میرا رزق اوپر والوں سے نہیں بلکہ بہت اوپر سے آتا ہے اور کوئی اسے راستے میں کاٹنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ جس کی بندگی میں کرتا ہوں وہی میرا رازق ہے اور جو کوئی مجھے رزق کی دھونس دیکر اپنی بندگی پر مجبور کرنا چاہتا ہے میں اس کی خدائی کو نمرود کی خدائی سمجھ کر ٹھکراتا ہوں ان اللہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین"۔ میرے اس استعفے کے بعد مجھے دوسری کئی کمپنیوں میں سے بلاوہ آیا لیکن دل اب اس قدر پریشان ہو چکا تھا کہ ایک عشرہ سے زائد جس خطے میں گزارا تھا وہاں کل کا سورج دیکھنے کی تمنا بھی باقی نہیں رہی تھی۔ پاکستان کے بارے میں جو حسین تانے بانے بنے ہوئے تھے وہ بھی سراب نظر آ رہے تھے۔ سوچا کہ اب مغرب کی طرف منہ کر کے خدا کی بندگی کا جو عہد دن میں کم از کم پانچ مرتبہ کرتا ہوں کیوں نہ دنیا کے مغرب میں جا کر اس کا اظہار کروں۔ آپ میرے استعفیٰ پر منہ پھلائے بیٹھے تھے، آپ سے مشورہ کرنے کیلئے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ گویا آپ پھٹ پڑے۔ لیکن جب اصولوں کی بات

ہوئی تو آپ مات کھا گئے۔ آپ نے اپنا تبادلہ بہ امر مجبوری اور مصلحت کے تحت قبول کر لیا لیکن مجھے آپ سے "ضدی" اور نجانے اور کیا کیا القاب سننے کو ملے حالانکہ ارفع مقاصد کیلئے بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔

مرحوم قائداعظم کے نام سے کون واقف نہیں جو ہندوؤں اور انگریزوں کے مجموعی دباؤ اور لالچ کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح ڈٹے رہے، اپنا مقصد کسی قیمت پر بیچنے کو تیار نہ ہوئے۔ مسلمان کو چھوڑیئے یہ تو تاریخ کے اندر بڑا جانباز کردار لے کر آیا ہے۔ یہ تو علم دین شہید بن کر رسول اکرم ﷺ کے نام کی آبرو پر دیوانہ وار قربان ہو جاتا ہے۔ آپ کافروں کو ہی لے لیں، بھگت سنگھ جو آزادی کی کاطر اپنی جان نچھاور کر گیا۔ ہزاروں کیمونسٹوں کو دیکھ لیں جو زارِ روس کی بدترین سزائیں بھگتے رہے۔ چینی اشتراکیوں کو دیکھ لیں جو خاقان چین کی بیس سال تک بدترین اذیتیں سہہ کر بالآخر اسے پچھاڑ گئے۔ مردِ مجاہد سید علی گیلانی کو ہی دیکھ لیں کہ باوجود ضعیف العمری اور ساری عمر مصائب میں مبتلا ہونے کے ان کے عزائم قابل رشک حد تک جواں ہیں کہ وہ اب تک اپنے ملک و قوم کی آزادی کیلئے ایک لمحہ غافل نہیں رہے۔ پچھلے تریسٹھ سالوں سے کشمیری کیسی لازوال قربانیاں دیتے چلے آ رہے ہیں کہ دشمن ظلم کرنے کے باوجود بے بس ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے بڑی ایٹمی قوت دی ہے۔ وہ تو جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کیلئے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ فرہاد بنتا ہے تو جوئے شیر نکال لاتا ہے، رانجھا بنتا ہے تو تاریک جنگلوں میں بھینسوں کے گلے چراتا ہے، ایک نازک اندام لڑکی کے روپ میں اپنے مقصد کی خاطر چناب کی تند و تیز لہروں سے لڑ جاتا ہے، میں نے تو بھی صرف مغرب کا رخ کیا تھا۔ سعی مسلسل اور پیہم کوشش کا راستہ اختیار کر کے اس فرنگی ملک میں جو کہ ڈھائی صدیاں حکمرانی کر کے اب تک غلامی کے وہ اثرات چھوڑ کر آیا ہے جس سے ہم ابھی تک نکل نہیں پائے لیکن کشمیر میرے دل و نگاہ سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔

بالکل انہی کی مانند تاجر کی صورت میں اس ملک میں داخل ہوا ہوں۔ مجھے یاد ہے مجھے رخصت کرتے وقت بہت سے دوستوں کی موجودگی میں آپ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے جبکہ میرے ذہنی و قلبی دکھ درد کو نظر شناس بھانپ گئے تھے۔ لیکن ایک انگارہ تھا جسے برف کی دبیز تہوں میں ڈھانپ کر رکھ دیا گیا تھا لیکن اس کی حدت پھر بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں تو اس وقت بھی پریشان نہیں تھا کیونکہ کرم شب کی قدر و قیمت رات کی تاریکی سے ہی ہوتی ہے اور تاروں کے حسن کا جھومر ظلمتِ شب کی سیاہ پیشانی پر ہی کھلتا ہے۔ چاند کا کنگن رات کی دلہن کو ہی میسر آتا ہے اور بارش کے قطرے کیلئے تپتی ہوئی زمین کا پیاسا دامن ہی سمندر کے لبریز پیمانے سے زیادہ مستحق طالب اور شائق ہوتا ہے۔ اپنی کمیابی اور اجنبیت پر میں کبھی بھی پریشان نہیں ہوا، ہر قیمتی شئے کمیاب اور نادر ہوتی ہے اور پھر یہ حدیث تو آپ نے کئی مرتبہ پڑھی اور سنی ہو گی کہ:

"ایک وقت مومن کا ایمان بچانا اپنی مٹھی میں انگارہ تھامنے کے مترادف ہو گا"۔

اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ عالمِ اسباب میں سانس کا ایک تموج اور ذرے کا ایک حقیر وجود بھی تخلیقِ اسباب اور ترتیبِ نتائج میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ جس طرح عمل بد کی ایک خراش آئینہ ہستی کو دھندلا جاتی ہے اسی طرح کلمہ خیر کا ایک بول بھی عالم کے اجتماعی خیر

کے ذخیرے میں اضافہ کر دیتا ہے اور لوحِ زمانہ میں ریکارڈ ہو کر کبھی نہ کبھی ضرور گونجتا اور میزانِ نتائج میں اپنا وزن دکھاتا ہے۔ بس ذرا بدی کا شکنجہ ڈھیلا پڑنے کی دیر ہے کہ خیر کی کھیتی لہلہا اٹھے گی، نیکی کا اگر ایک ذرہ بھی معاشرے کے اجتماعی ضمیر میں موجود ہو گا تو وقت آنے پر ضرور گلستانِ رعنا بن کر نمودار ہو گا۔ بس اک آرزو بدلنے کی دیر ہے! میری شدید خواہش ہے کہ میں بھی کشمیر کے ان لالہ زار کو پنی آنکھوں سے بوسے دوں جہاں میرے آباؤاجداد کئی مختلف قبرستانوں میں آسودہ خاک ہیں۔ اب دیکھیں یہ آرزو کب پوری ہوتی ہے،،۔

نہ ہم بدلے نہ تم بدلے نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

# تلاشِ حق

## محترم رفیق عزیز

## اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آپ پر اللہ کی سلامتی و برکت ہو آپ کے قدم استقامت علی الحق کے ستون ہوں، آپ کا سینہ بدر کی چٹان، بازو غازیان صف شکن کی حوصلہ خالد سیف اللہ کا پیکان ہو۔ کتنی ہی ان گنت دعائیں اور پر خلوص محبتیں آپ کیلیئے رکھتا ہوں، آپ کے قدموں کی سنان اور دھمک میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز اور راہِ حق کے نشیب و فراز کو ہموار کرتی چلی جایا کرتی ہے۔

آج ایک مدت کے بعد آپ سے قلمی طور پر مخاطب ہوں حالانکہ آپ کے کئی ایک مکاتیب طویل و مختصر میری فائل میں اس طرح آرام فرمارہے ہیں جیسے مومن اپنی قبر میں۔ لیکن اس آخری طویل خط میں آپ نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں آپ کی تحریر کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک مدت سے آپ مشرق کی پنہائیوں میں کھوگئے ہیں اور میں مغرب کی ظالم مردم خور تہذیب کا شکار ہوں لیکن بقول آپ کے "اسلام اگر گلشن ہے تو اس کیلیئے بادِ سموم مغربی تہذیب ہے"۔ جہاں اس تہذیب نے انسان کو انسان سے کاٹ کر رکھ دیا ہے، مادہ پرستی کا شکار کر دیا ہے، آنکھوں سے شرم وحیا کا پانی اتار دیا ہے اور انسانی سطح سے حیوانی سطح پر لا کر چھوڑ دیا ہے لیکن وہاں ہمدردی، اخلاق، مہرو محبت، بے لوث خدمت، ایثار و قربانی، کمزور پر رحم اور محروم پر شفقت کا تصور عملاً یہاں دیکھنے کو ملا ہے۔

سوڈان، صومالیہ میں قحط سے مسلمان پریشان ہوں یا بنگلہ دیش، پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے انسانیت سسک رہی ہو، یہاں کا بوڑھا پنشن یافتہ طبقہ بھی ان کی عملی مدد کیلیئے اپنے دل میں تڑپ رکھتا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ عادت حسن فطرت سے کس قدر قریب ہے!

حسن بے پرواہی کو اپنی بے حجابی کیلیئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

آخری مرتبہ واشنگٹن میں دوران کانفرنس ملاقات کا موقع ملا، کتنی ہی باتیں ہوئیں، مجالس تعارف میں بندھے بندھائے تعارفی پروگرام کے تحت ہم کتنی بار متعارف ہوئے لیکن پھر بھی کھل کر باتیں کرنے کی حسرت دل میں رہی۔ بارہا ایسے مواقع آئے کہ ہم کچھ اپنی باتیں کرتے لیکن انفرادی گفتگو کی بجائے سیمناروں، کانفرنسز، اجتماعات میں ہم طویل تقریریں تو کرتے رہے، مشرق و مغرب میں پاکستان اور عالم اسلام میں اسلامی انقلاب کی ڈھیر ساری باتیں کرتے رہے، اس کے طریقہ کار پر لوگوں کی فکر کی اصلاح کی منصوبہ بندیوں میں حصہ لیتے رہے لیکن آپس کی باتوں کا ایک ڈھیر جمع ہو گیا۔ آپ تو خطوط کے ذریعے پھر بھی اپنا پیٹ خالی کرتے

رہے لیکن مجھے تو اس کی بھی فرصت نہ ملی۔آج آپ کا ٹیلیفون پر محبت بھرا پیغام اور خصوصی خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا تو سوچا یہ شب آپ کے نام کر دوں، جو ڈھیروں سوال جواب طلب ہیں ان کو ضابطہ تحریر میں لے آؤں تو بہتر ہے۔

گاڑی کے پہیوں کی مانند ہم بھی مسلسل حرکت میں رہے، ایک پہیہ دوسرے سے کیا بات کرے، بس یہی کہ کتنے اسٹیشن گزار آئے، کتنے میل دوڑ آئے، کتنی منزل باقی ہے، حال دل اور دردِ دل سنانے کی مہلت نہ ملی تھی، نہ ملی اور نہ ملتی نظر آتی ہے۔اپنے ساتھیوں کو حال دل سنانے کیلئے ٹیپو سلطان کو سب سے عمدہ مہلت سرنگاپٹم کے دروازے پر جان دیکر ملی تھی اور شائد ہمیں بھی یہ مہلت زیرِ زمین پہنچ کر ہی ملے گی جہاں چار آدمیوں کی شاہانہ سواری پر دراز ہو کر پہنچیں گے۔اس سے پہلے تو سارا علاقہ تگ و دو میدان جنگ، ساری مدت حیات زمانہ جنگ، سارا اسامان زیست اسلحہ جنگ، ساری خبریں حالاتِ جنگ اور ساری زندگی جنگی مورچہ ہے۔دشمن دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر طرف سے حملہ آور ہے، ساری زندگی سمٹ کر چو مکھی لڑائی کا ہتھیار بن گئی ہے۔جس روز یہ ہتھیار کند ہو گا ، گردن سینے پر ڈھلک آئے گی تب کہیں مہلت یک دو نفس ملے گی کہ کیسی گزری، کیونکر گزری کا حالِ دل ملائکہ کو سنائیں گے۔

کتنے ہی احباب کی یادیں ماضی کے وسیع دھندلکے میں مصری عجائب خانے کی ممیوں کی طرح پڑی ہیں۔بے حس و حرکت، منجمد اور بے روح، کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ان تمام قدیم یادوں پر پھپھوندی سی لگ گئی ہے۔ماضی کے وسیع میدان میں جہاں نشیب و فراز کی بھی کمی نہیں، کتنے ہی احباب ہیں جنہوں نے حافظہ کے بے کنارہ میدان میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں، ان کو آواز دیں، ان کو سنائی نہیں دیتی، انہیں بلائیں تو کوئی جواب نہیں آتا، معلوم ہوتا ہے کہ حافظہ کی دھندلی شاہراہ پر گزرے ہوئے راہگیروں کے نقوش قدم ہیں جو ایام کی گرد کے نیچے مدھم پڑتے جا رہے ہیں، آپ اور میں بھی ان مدھم نشانات میں ایک نشان بن کر رہ گئے ہیں۔آپ نے جو یاد کیا تو محسوس ہوا کہ ممیاں بھی گفتگو کرتی ہیں اور ماضی میں سے بھی چھن چھنا کر آوازیں حال میں داخل ہو جایا کرتی ہیں۔

یقین کریں جب سے منہ پر موجود داڑھی میں سفیدی کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کوئی مسافر جو بغیر کسی زادِ راہ لئے کسی طویل سفر کیلئے چل نکلا ہو، اور اپنے ہی بچھائے ہوئے کانٹوں کو پلکوں سے صاف کر کے یا تو اس لق و دق صحرا میں جان دیدے گا یا ایسی کھائی میں گر جائے گا جہاں اندھیرے استقبال کریں گے اور روشنی کا دل مسوس ہو کر رہ جائے گا:

اک دیا اور بجھا روشنی روتی رہی

بھلا ہو ان چند دوستوں کا کہ مجھ جیسے کھوٹے سکوں کی کالک اور سیاہی کو اتارنے کا بندوبست پچھلے دنوں لندن کے ایک دور دراز گاؤں میں کر رکھا تھا۔ دنیا سے کٹ کر مافیہا کے قریب انسانی کردار کی اصلاح جس انداز سے یہ حضرات کرتے ہیں اس سے دل میں ایک آرزو پیدا ہوتی ہے کہ یوم حشر کی گھڑی جب "ان الحکم الا اللہ" اور "لمن الملک الیوم" کا نعرہ بلند ہو گا تو میں بھی گھگھیائی آواز میں "للہ الواحد القھار" کا جواب انہی لوگوں میں کھڑا ہو کر دوں، یہی وجہ ہے کہ مجھے ان دوستوں کے ایسے تربیتی اجتماعات میں شرکت سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ قیمتی دلنواز اور محبوب محسوس ہوتی ہے۔

ان دوستوں نے توحید کی یہ شمع ایک مدت سے جلا رکھی ہے اور یہ شمع اپنے رخِ تاباں سے اندھیرے کے اندر نور کے چھینٹے مسلسل برسا رہی ہے۔ اس شمع پر اس کے جانثار پروانے کدھر کدھر سے آئے، کن کن تاریکیوں کو پھلانگ کر آئے، کیسے دیوانہ وار آئے، کیا کیا تاثرات، عشق و محبت اپنے سینوں میں تڑپتے ہوئے لیکر گئے، یہ داستان ہجر و وصال بڑی دراز، بڑی پر لطف اور بڑی پر کشش ہے۔ وقت کم ہے، گردشِ روزگار میں بڑی تیزی ہے، کسے فرصت ہے کہ کہی ہوئی کہانیاں دہرا سکے، بکھرے موتی چن سکے، چٹکے ہوئے پھول و کلیاں چن چن کر دامن بھر سکے، ایک لحظہ اور کارواں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے۔ اس رواداری میں حکایات خونچکاں سنانے کی کسے مہلت ہے۔ بہر حال آپ کا تقاضہ ہے کہ اس شمع توحید کی کچھ خوبیوں کا تذکرہ کروں جنھوں نے ہزاروں لوگوں کے دلوں کو موہ لیا ہے، اس راہِ محبت کے ان مقامات کا تذکرہ کروں جنھوں نے کتنے ہی اربابِ دل و نگاہ کو مسخر کر کے اپنا گرویدہ اور اپنی منزل کا مستقل راہی بنالیا ہے لیکن محترم! یہ بات کسی ایک شخص کے بتانے کی نہیں ہے۔

جب کسی محبوب کے ہزاروں شیدائی ہوں تو ظاہر ہے کہ اس محبوب کے عشوہ وادا کے بھی ہزروں انداز ہوں گے اور وہ بو قلموں خوبیاں اسی صورت میں سامنے آئیں گی جب عشاق کرام کا ہجوم ہو...... ! اور وہ اپنی اپنی جراحت دل کی داستان اپنی عاشقانہ زبان میں بیان کرے۔ بس یہ اجتماع بھی ایسے عشاق کا تھا۔ بہر حال وہاں جو جواہر ریزے اپنے تنگ دامن میں جمع کر سکا، اس محبوب ازل کے کشتگان کی داستان وابستگی کے جن جن حصوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا، آپ کی ضیافت طبع کیلئے تحریر کئے دیتا ہوں!

آپ جانتے ہیں کہ مقصد زندگی کی جس سنگلاخ وادی میں سے یہ قافلہ جان گزر رہا ہے وہ کٹھن بھی ہے اور دشوار بھی، حوصلہ شکن بھی ہے اور صبر آزما بھی، لیکن ایک نصب العین کے حامل جب کچھ ساتھ جمع ہو جائیں تو سارے بوجھ اتر جاتے ہیں، شکائتیں دور ہو جاتی ہیں، دل شگفتہ ہو جاتے ہیں اور اشتراک غم، مرگ انبوہ کا جشن پیدا کر دیتا ہے ۔ پھر کوئی حالات کے ہاتھوں دل گرفتہ نہیں ہوتا اور منزل کی کٹھن گھاٹیوں کا کوئی شکوہ سنج نہیں رہتا۔ اس وقت محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کوئی رہینِ ستم ہائے روزگار لوگ نہیں ہیں بلکہ منہ زور زمانے کے شہ سوار ہیں اور حالات کی لگام تھامے جس طرف چاہیں زندگی کا رخ موڑ کر لیجا سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں ذکر و شکر ان کے لبوں پر ہوتا ہے تو عزیمت آگے بڑھ کر ان کے قدم چومتی ہے۔

اس محفل میں،، اپنی تربیت آپ،، کے اصول پر سب دوست جمع تھے۔ جب یہ ذکر چل نکلا کہ نصب العین کی محبوبہ عالم کی کس ادا سے کون مجروح ہوا، ظاہر ہے کہ عشاق کی محفل میں جب ذکر محبوب کی اداؤں کا چھڑ جائے تو بات قیامت کا رنگ دھار لیتی ہے اور

تب پتہ چلتا ہے کہ کشتی دل کیلئے محبوب کا ہر سانس ایک طوفان اور مرغ آرزو کیلئے اس کا ہر رونگٹا ایک بے پناہ تیر کی حیثیت رکھتا ہے۔رشید بھائی جو اس محفل کے دولہا تھے،اس محفل عشاق کا آغاز جب غم ناک چشم سے خوفِ خدا، آخرت کی جوابدہی اور اس زمانے میں دین کی مظلومی سے کیا تو گویا وقت تھم گیا ہو، سانس کا تسلسل جو پچھلی چھ دہائیوں سے کبھی مشکل نظر نہیں آتا تھا، اب اگلے سانس لینے کی گویا ہمت نہ ہو۔ مجھ جیسے گناہگار کو سورۃ بقرہ کی آیت چالیس سے لیکر چھیالیس تک درس قرآن کا جب حکم ملا تو محسوس ہوا کہ قرآن کی ان آیات میں یہود کو نہیں بلکہ مجھے مخاطب کیا جا رہا ہو۔قرآن جو ایک زندہ معجزہ، اپنی جبروت وسطوت کے رنگ دکھا رہا تھا وہاں میرا اپنا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا، قلب وضمیر ساتھ نہیں دے رہے تھے، زبان یوں لڑکھڑا رہی تھی جیسے اس نے بولنا کبھی سیکھا ہی نہیں.....سب دعائیں یاد نہ رہیں بس یہی سرور، کائنات ﷺ کی دعا کہ :

"اے رب ذوالجلال ! میرا سینہ اس کیلئے کھول دے اور سمجھنے وعمل کی توفیق نصیب فرما آمین"۔

بعد میں دوستوں کا اس پر تبصرہ، سینہ مزید کھلتا گیا، دماغ سے پردے ایک ایک کر کے ہٹ رہے تھے، خدا کی وحدانیت کا یقین، رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارک، اصحابہ کرام کا ایثار، قربانی واستقامت دل پر نقش ہو رہے تھے اور کالک وسیاہی اس طرح دور ہو رہی تھی جس طرح کالے بادلوں سے اٹا ہوا آسمان نور کی پہلی کرن سے خوفزدہ ہو کر اس کیلئے جگہ چھوڑ رہا ہو، اور واقعی قرآن کی یہ آیت کہ :

"جب حق آتا ہے باطل بھاگتا ہے، روشنی آتی ہے، اندھیرا چھٹ جاتا ہے" کی عملاً تفسیر اپنے دل کی کیفیت سے محسوس ہوئی۔ غیر مسلموں کے اس معاشرے میں اسلام کی دعوت، پلاننگ، نمائش، تعارف، غرضیکہ زندگی کے تمام ضروری پہلوؤں پر اس مختصر وقت (ڈھائی دن) میں اس طرح عملی روشنی پڑی کہ سب ہی اندھیرے چھٹ گئے، گرد دور ہوئی تو ذہنی بوجھ اور جسم کو اس طرح ہلکا محسوس کیا کہ داڑھی کی سپیدی بھی کچھ اچھی نظر آنے لگی اور دل میں یہ احساس جاگزیں ہو گیا کہ اس کیفیت میں محبوب سے ملاقات ہو گئی تو عاشقِ صادق کا پروانہ مل جائے گا اور وصل بھی نصیب ہو جائے گا۔

آیئے ! اپنی زندگی کے عشق کا آغاز اس انداز سے کریں کہ محبوب منتظر ومضطرب ہو، بے چین ہو اور بے ساختہ یہ کہے :

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے

یہ بندۂ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے

دعاؤں کی درخواست پر اجازت چاہتا ہوں

فی امان اللہ

# سفرِ شہادت

محترمی برادرم عتیق راجہ

اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابھی چند لمحے پہلے آپ کے بیٹے کی شہادت کی خبر ملی کہ برخوردار اس فانی دنیا سے دار بقاء کی طرف تشریف لے گئے ہیں، اس عارضی زندگی کی بہاروں اور گلوں کی خوشبوؤں سے منہ موڑ کر دائمی بہار، سدا خوشبوؤں و مہک کے گلستانوں میں براجمان ہوگئے ہیں اور اپنے ہر تعلق رکھنے والوں کو چھوڑ کر اپنے مولا کے ساتھ مضبوط تعلق کا رشتہ جوڑ چکے ہیں۔

برادرم! موت تو کوئی نئی چیز نہیں۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے۔ موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ کوئی ولی۔ جو بھی آیا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کرکے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ موت زندگی کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ ہم سب اس کی امانت ہیں، پھر کس کی مجال جو اس میں خیانت کر سکے۔ کسی کا اس بھری جوانی میں اس طرح حالتِ ایمان اور راہِ خدا میں قربان ہو جانا اس کے حق میں بڑی نعمت ہے اور پھر کیوں نہ ہو، ایسی موت تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا خوبصورت سبب اور حسین ذریعہ ہے اور پھر بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت کیا ہوگی۔

انتہائی واجب الاحترام! اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے یقیناً ایک دن جانا ہے اور اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنے ماں باپ، لواحقین اور اہل وطن کیلئے ایسی دولت اور فخر وانبساط کی ایسی وراثت چھوڑ جاتے ہیں کہ جس کے آگے خزائن وحشم سے مالا مال شہنشاہ بھی سو فقیروں کے فقیر اور سو کنگالوں کے کنگال لگتے ہیں۔

آپ اپنی اولاد کے قلب وذہن کے اندر پچھلی کئی دہائیوں سے عملِ خیر کا بیج بو چکے تھے، اس بیج پر مشیت کی برسائی ہوئی برسات نے بالآخر کس طرح عمل خیر کی لہلہاتی ہوئی کھیتی اگا دی۔ اگر اس فصل کی تقسیم شروع کر دی جائے تو سب کو ہی اپنا دامن تنگ نظر آئے گا۔ ان نوجوانوں نے اپنے خونِ دل اور جان سے پائے رسول ﷺ کے نقوش کو ایسا اجاگر کیا ہے کہ ہر کسی کو اب اپنی منزل آسان دکھائی دے رہی ہے۔ ان نوجوانوں کی للہیت، اخلاص نیت اور بے لوث ادائے فرض نے ایک ہی جست میں تمام فاصلے عبور کر لئے ہیں جس کی تمنا انبیائ، اصحابہ اور صالحین نے ہمیشہ کی۔ ان عظیم نوجوانوں کی یاد اب تا قیامت تک کفر کے تاریک جزیروں پر ایمانی قوت کے ساتھ کڑکتی اور کوندتی رہے گی۔

اس برخوردار کی شہادت نے جہاں اور بے شمار باتوں کا سبق یاد دلایا ہے وہاں ایک یہ بات بھی ہمارے ذہن نشین کروائی ہے کہ عالمِ اسباب میں سانس کا ایک تموج اور ذرے کا ایک حقیر وجود بھی تخلیق اسباب اور ترتیب نتائج میں اپنا حصہ رکھتا ہے۔ جس طرح عمل بد کی ایک خراش بھی آئینہ ہستی کو دھندلا جاتی ہے اسی طرح عمل خیر کا ایک لمحہ بھی عالم کے اجتماعی خیر کے ذخیرے میں بے پناہ اضافہ

کر دیتا ہے اور لوحِ زمانہ میں ریکارڈ ہو کر کبھی نہ کبھی ضرور گونجتا ہے اور میزان نتائج میں اپنا وزن دکھاتا ہے اور یوں آخرت کو جب گروہ در گروہ اپنے رب کے ہاں حاضر ہونگے تو یہ نوجوان (ارشد بشیر، وسیم راجہ اور ظہور احمد) بھی شہداء کے کے گروہ میں شامل اپنے رب کے ہاں اس شان سے حاضر ہوں گے کہ تمام عالم ان پر رشک کرے گا۔

محترمی عتیق صاحب!

خدا سے ہم نے بھی ملاقات کرنی ہے، خدا جانے کب......؟ خدا جانے کہاں......؟ اور کس حال میں ہونگے؟ کتنی بڑی ملاقات ہو گی جب ایکعبد ذلیل اپنے معبود اکبر سے ملے گا! جب مخلوق دیکھے گی کہ خود اس کا خالقِ اکبر اس کے سامنے ہے، خدا کی قسم ......! کیسے خوش نصیب ہیں یہ نوجوان کہ جلوہ گاہ میں اس شان سے جائیں گے کہ اس ملاقات کے موقع پر خدا کو نذر کرنے کیلئے خداکا کو کوئی انتہائی محبوب تحفہ ان کے کفن میں موجود ہو گا۔

جی ہاں! ان کفنوں کی جھولیوں میں جن میں بدن اور سچے ایمان و عمل کی لاش ہو گی مگر شہادت کے طمطراق تمغے سے سجی ہو گی۔ ان تمغوں کو خدائے برتر کی رحمت لپک لپک کر بوسے دے گی اور اعلان ہو گا:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندۂ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کاش ہمیں بھی اس ملاقات اور یقینی ملاقات کا کوئی خیال آتا اور تڑپا دیتا، کاش ہم بھی ایسی موت سے ہمکنار ہو جائیں جہاں فانی جسم کے تمام اعضاء باری باری قربان ہو جائیں، سب خدا کیلئے کٹ جائیں، سب اسی کے پائے ناز پر نثار ہو جائیں جس کے دستِ خاص نے ان کو وجود کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یقیناً ان نوجوانوں کے دھڑ شیطانی قوتوں کا شکار ہو گئے ہیں مگر اشک بار آنکھوں سے سو بار چومنے کے لائق ہیں کہ فرشتے ان کو اٹھا کر اللہ کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں اور ان کی جوانیاں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ دنیا پر نہیں یہ آخرت پر نثار ہوئی ہیں۔ انہوں نے دنیا کی کسی چیز سے نہیں خود خدا سے عشق کیا' انہوں نے دنیا کی ساری اشیاء اور عیش و عشرت پر نہیں خود رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ایمان کی بنیاد رکھی' انہوں نے دنیا کی نشیلی چھاؤں میں نہیں بلکہ شہادت کے پر شوق سائے میں پناہ ڈھونڈی' انہوں نے زندگی کی دلفریب اور ایمان کی شاہکار شاہراہ پر اس طرح سفر کیا ہے کہ زندگی سے ہٹ کر شہادت اور شہادت کے اس پار تک کچھ سوچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شباب و حسن سے وجد کرتے ہوئے اللہ کے ہاں اس طرح حاضر ہو گئے ہیں کہ حسن و جوانی بار بار ایسی

حسرت کرے!

وہ زندگی اور دنیا پر جھومنے کی بجائے سچائی اور آخرت پر مر جانے کی رسم ادا کر گئے تاکہ زمین و آسمان ان کی موت پر آنسو بہائیں لیکن خدا اپنے فرشتوں کی محفل میں خوش ہو کہ اس کا بندہ اس کی بارگاہ تک آن پہنچا۔ دراصل کشمیر کو آزاد دیکھنے والے ہر نوجوان کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا گھر اس دنیا میں کہیں نہیں بلکہ اس دنیا میں ہے جو جسم و جاں کا تعلق ٹوٹتے ہی شروع ہوتی ہے۔ ایسی دنیا جہاں خود خدا اپنے بندوں کا منتظر ہے کہ کون ہے جو دنیا کے بدلے آخرت اور آخرت کے بدلے اپنی دنیا فروخت کر کے مجھ سے آن ملے۔ جہاں وہ جنت ہے جس کے گہرے اور ہلکے سبز باغات کی سرسراہٹوں اور شیر و شہد کی اٹھلاتی لہراتی ہوئی ندیوں کے کنارے خوف و غم کی پرچھائیوں سے دور ایک حسین ترین دائمی زندگی' سچے خوابوں کے جال بن رہی ہے۔ جہاں فرشتوں کے قلوب بھی اللہ کے ہاں پکار اٹھیں گے کہ خدایا.....! یہ ہیں وہ نوجوان جن کی ساری دنیا تیرے عشق میں لٹ گئی ہے' یہ سب کچھ لٹا کر تیری دید کو پہنچے ہیں' ان کے قلوب میں یہ بات راسخ ہو چکی تھی کہ راہِ حق میں مارا جانا ہی دراصل تجھ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور شہادت کے معنی ہی ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ یہ تو سب کچھ لٹا کر اس یقین تک پہنچے ہیں!

اور ہاں! کتنا قابل رشک ہے ان نوجوانوں کا یقیں اور ایمان' جن پر ملائکہ ایسی گواہی دیں گے اور کس قدر رونے کے لائق ہیں ہمارے ایمان جن کیلئے ہمارے دل بھی گواہی دیتے دیتے کسی خوف سے چپ ہو جاتے ہیں۔ کل جب میدان حشر میں اشک و لہو میں نہائے ہوئے یہ نوجوان خداوندی لطف و اعزاز سے سرفراز کئے جا رہے ہونگے' خدا جانے ہم کہاں اور کس حال میں ہونگے؟

یقیناً آپ کے بیٹے نے تو آپ کو سرخرو کر دیا جس کی بناء پر آپ اور آپ کے اہل خانہ دنیا و آخرت میں مبارکباد کے مستحق ٹھہرے ہیں، اللہ آپ کے بیٹے کی شہادت قبول فرمائے اور اس کی جزا دنیا و آخرت میں عطا فرمائے۔ آمین وثم آمین

خیر اندیش واحقر

سمیع اللہ ملک

# اک شخص اندھیرے میں اجالے کی طرح تھا

یوں نہ پھر ہوگا کوئی نغمہ سرا میرے بعد
اور ہی ہوگی گلستاں کی فضا میرے بعد
راہ سنساں مکاں خستہ مکیں افسردہ
کیسا ویراں ہوا شہرِ وفا میرے بعد

سرو قد و سجیلا 'بلند و بالا کسرتی بدن 'سرخ و سفید رنگت 'کشیدہ قامت 'گلابی و معصوم چہرہ 'فراخ جبیں 'منفرد و حسیں ' خوبصورت سرمگیں آنکھیں جن میں بلا کی چمک بلکہ ہیرے کی دمک 'پھر ان میں شب زندہ داری کی وجہ سے لال لال ڈورے 'جائزہ لیتی ہوئی نگاہیں 'ستواں اور اونچی ناک 'خوبصورت نازک پتلے ہونٹ 'کشادہ و غنچہ دہن 'سرخ رخسار بمثل قندھاری انار 'سلیقے و قرینے کی ملائم و ریشمی ریش مبارک جس میں سیاہی سے سفیدی ہم آغوش 'قریب تھا کہ سینہ ڈھانپ لے 'ترشی ہوئی مونچھیں 'سر منڈا ہوا مگر قراقلی ٹوپی سے ڈھکا ہوا 'لہجے میں سوز و عاجزی 'آواز میں اقبال 'چال میں کمال 'طبیعت میں جلال 'سر تا پا استقلال 'رفتار میں حکومت 'گفتار میں سطوت 'عظمت کشمیر کی معنوی صفات کا عکسِ جمیل 'صبا کی طرح نرم اور رعد کی طرح گرم 'ایک جیتی جاگتی کہانی 'ارض کشمیر جنت نظیر کی نشانی 'ایک حصار جس کی قربت سے حشمت کا احساس ہوتا ہے اور جس کی دوری میں عقیدت نشو و نما پاتی ہے 'گویا شکل میں شہنشاہ تو عادات میں بے پناہ ! یہ ہے ان کی جھلک جن کا نام نامی ہے حبیب اللہ ملک !

جن کی یادوں سے رگِ جاں میں دکھن ہونے لگے
ذکر چھڑ جائے تو پتھر کا دل بھی رونے لگے

۳۵ برس قبل آج ہی کے دن ۳ دسمبر ۱۹۶۵ء جمعۃ المبارک بوقت ۳بجکر ۱۳ منٹ بمقام سول ہسپتال کمرہ نمبر ۵ لائلپور میں ایک ایسی عظیم المرتبت شخصیت نے اس عارضی زندگی کی بہاروں سے منہ موڑ لیا کہ جیسے انہوں نے جان لیا ہو کہ اب میرا ٹھکانہ ایسے دار بقاء میں ہے جہاں سدا بہار خوشبوؤں کے گلستان ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی قدر و قیمت کا ایک معیار ہے اسی طرح اس جہاں کے گلستاں میں داخلہ کا ٹکٹ بھی ایسا ارزاں نہیں۔ زندگی جیسی قیمتی دولت دیکر موت نصیب ہوتی

ہے اور پھر موت ہی تو وصل حبیب اور بقائے حبیب کا سبب اور ذریعہ ہے۔ بقائے حبیب سے بڑھ کر اور نعمت بھی کیا ہو گی ! کیا خوب کہ آج ہزاروں دلوں کا حبیب اپنے حبیب کے حضور حاضر ہو گیا۔

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دور بسائیں ہیں بستیاں

کہتے ہیں دنیا میں ایسی جھیلیں بھی ہیں جن کا پانی بیک وقت شیریں بھی ہے اور نمکین بھی' ان کے ایک حصے میں میٹھا اور شیریں پانی بہتا ہے اور دوسرے حصے میں نمکین اور کڑوا کسیلا۔ قدرت کا کیسا معجزانہ کمال ہے کہ ان میں پانی کی دونوں سطحیں الگ الگ رہتی ہیں اور ہر حصے کا پانی اپنا ذائقہ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جب بھی ان کا مبارک خیال آتا ہے تو میرے ذہن میں ایک ایسی ہی جھیل کا تصور جاگ اٹھتا ہے۔ کئی سال گزر گئے' ہزاروں دفعہ قصد کیا کہ ان تصورات اور خوبصورت یادوں کو الفاظ کی زبان دوں لیکن ایک غیر مرئی خوف کی بناء پر ایسا نہ کر سکا' شائد بزدل، خوفزدہ اور کمزور ہوں کہ ان تمام یادوں کا احاطہ نہ کر سکوں گا لیکن آج توحد ہو گئی' بعض اوقات گم گشتہ یادوں کے بارود کے ڈھیر میں حالات و واقعات کا آتش گیر مادہ جمع ہوتا رہتا ہے لیکن دھماکے کیلئے کوئی چنگاری میسر نہیں آتی یا یوں سمجھ لیں احتیاط کی بناء پر چنگاری سے محفوظ رکھنا اصول حیات ٹھہر جاتا ہے لیکن آج انجانے کیوں دل نے ایسی چنگاری دکھائی کہ تمام یادوں کو ایک دھماکے سے اڑا کر رکھ دیا ہے۔

۳ دسمبر ۱۹۶۵ء بروز جمعۃ المبارک کو میں جب آپ کے پاس فیصل آباد کے سول ہسپتال کے کمرہ نمبر ۵ میں بیٹھا تھا تو آپ نے نیم کھلی آنکھوں سے پوچھا کہ "آج کون سا دن ہے؟ تایا جان نے جواب دیا کہ آج جمعہ ہے تو آپ نے اپنی رفیقہ حیات کی طرف نگاہ اٹھائی جو فوراً آپ کی نگاہوں کا مطلب بھانپ گئیں۔ آپ کو بستر پر ہی وضو کروا دیا گیا۔ آج پچھلے دس دنوں کی نسبت طبیعت میں خاصا سکون تھا۔ چہرے پر کمزوری کے باوجود رونق بھی لوٹ آئی تھی۔ دیرینہ ساتھی حافظ صاحب سے خصوصی فرمائش پر کافی دیر تک قرآن کریم سنتے رہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ حافظ صاحب خوش الحانی کے ساتھ سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیات پر پہنچے تو آپ کی آنکھوں سے ساون بھادوں شروع ہو گیا۔ میں نے فوراً اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر لیا کہ برداشت کا یارانہ تھا۔ آپ نے ہم سب کو جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا۔

سب ہی ہسپتال سے ملحقہ مسجد کی طرف چل دیئے لیکن نجانے کیوں میرے قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ رکھتا کہیں تھا' پڑتے کہیں تھے۔ مڑ مڑ کر نگاہیں کمرے کا طواف کر رہی تھیں' ایک انجانا سا خوف دل کو بے قرار کر رہا تھا۔ پچھلے دس دن والدہ محترمہ ایک پل کیلئے آپ سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میرے میٹرک کے امتحان چل رہے تھے بس یوں سمجھیں کہ خانہ پری اور آپ کے احکام کی اطاعت ہو رہی تھی۔ میری امتحانات میں ہمیشہ یہ حالت رہی کہ مقررہ وقت ختم بھی ہو جاتا تھا اور مجھے لکھنے سے فرصت نہیں ملتی تھی لیکن اب کئی دنوں سے صورتحال بالکل مختلف تھی۔ اب شائد سب سے پہلے میں ہی اپنے پرچے سے فارغ ہو کر ہسپتال کی طرف بھاگتا تھا۔ میرے اسکول کے تمام اساتذہ کرام اور خصوصی طور پر میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاءاللہ صاحب کو پوری توقع تھی کہ امسال پورے ضلع میں نمایاں کامیابی میں میرا نام ضرور ہو گا لیکن اس انجانے حادثے کی کس کو خبر تھی۔ یہ تو شائد آپ ہی کی دعاؤں کا کمال تھا کہ اللہ تعالیٰ نے خصوصی کرم فرمایا ورنہ میری محنت اور کارکردگی تو آپ کی بیماری کی خبر نے سلب کر لی تھی۔

آپ جب سے ہسپتال میں صاحبِ فراش تھے' سارا شہر امڈ آیا تھا۔ کئی دفعہ ہسپتال کے عملہ نے اس طرف توجہ دلائی کیونکہ ڈاکٹروں کی ایک پوری جماعت ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔ ہسپتال کا دوسرا عملہ بھی کوئی ایمر جنسی ڈیوٹی کی طرح حاضر رہتا تھا۔ بعض اوقات آپ کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ آپ ناقابل برداشت تکلیف کا بڑی پامردی کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں لیکن منہ سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

آپ پچھلے چند ہفتوں سے مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے بے خانماں مہاجرین کے استقبال کیلئے ملک کی اگلی سرحدوں پر پہنچ گئے تھے۔ آپ فیصل آباد سے تیسری مرتبہ پورا ٹرک گرم کپڑوں اور دیگر ضروری اشیاء کا لیکر نہ صرف امدادی کاموں میں مصروف تھے بلکہ اپنے بھائی عصمت اللہ ملک اور دوسرے عزیز واقارب کو بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ میرے ننھیال کی ایک خاصی تعداد جو نہی پہنچی تو ان کو لیکر فوری فیصل آباد پہنچے مگر تیسری مرتبہ بھی اپنے بھائی کے بغیر بہت مایوس لوٹے۔ آپ کے اندرونی کرب کا بخوبی آپ کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا۔ ایک شام آپ نے مہاجرین کی بے بسی اور غریب الوطنی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ سننے والے سب افراد آبدیدہ ہو گئے۔ کئی ایک خاندان کی آباد کاری کے باوجود آپ کا دل مسلسل مہاجرین کشمیر میں اٹکا ہوا تھا شائد اپنے مہاجر ہونے کے مصائب دوبارہ دل میں تازہ ہو گئے تھے۔ آپ پھر سے مہاجرین کی آباد کاری کی کوششوں میں مصروف تھے کہ کمر کی اچانک درد نے بے حال کر دیا۔ رات بھر کمر کی سخت درد میں مبتلا رہے۔ دوسری صبح اپنے دوست حکیم ریاست علی سے جو ذکر کیا تو اس نے بغیر دیکھے زائد المعیاد پنسلین کا انجکشن بائیں بازو میں لگا دیا' گویا آپ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا اعلان جاری ہو گیا۔ وہ دن بڑی مشکل سے گزرا' درد کی شدت نے بے حال کر دیا' فوری ہسپتال پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا کہ درد میں افاقے کی بجائے زائد المعیاد ٹیکے نے سارے جسم میں شدید قسم کا انفیکشن پیدا کر دیا ہے۔ سب ڈاکٹر حیران تھے کہ پچھلے چوبیس گھنٹے کس طرح گزر گئے حالانکہ اس انفیکشن کے بعد تو زندگی چند گھنٹوں کی مہمان ہوتی ہے۔ یقیناً دمِ واپسی کے معین دن کا انتظار تھا۔

فوری طور پر سارے جسم کا مکمل خون تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے تین دن طبیعت سخت خراب رہی لیکن چوتھے دن طبیعت کافی سنبھل گئی لیکن یکایک طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بازو کاٹنے کا مشورہ دیا کہ دوبارہ اس انفیکشن کو سارے جسم میں پھیلنے سے روکنے کیلئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چچا جان جو خود ڈاکٹر تھے اور پہلے ہی دن سے سایہ کی طرح اس سارے عمل کی نگرانی کر رہے تھے' فوری آپریشن کی اجازت دے دی گئی۔ دوسری طرف مقامی اخبارات میں یہ خبر شائع ہونے سے حکیم ریاست علی کی گرفتاری کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ شہر بھر میں غم وغصہ کی ایسی لہر اٹھی کہ حکیم صاحب اپنا مطب بند کر کے شہر سے فرار ہو گئے۔ ایک دن اچانک حکیم صاحب اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہسپتال آپ کے قدموں پر سر رکھ کر گڑ گڑا کر معافی مانگ رہے تھے اور مجھے یاد ہے کہ آپ بسترِ مرگ سے بھی ان کو تسلیاں دے رہے تھے۔ ہم سب کی طرف منہ کر کے ارشاد فرمایا:

میں نے حکیم صاحب کو اس غیر دانستہ عمل پر معاف کر دیا ہے' آج کے بعد جو بھی ان کو تکلیف پہنچائے گا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ آپ کے ساتھ تعلق کو ختم کیا جائے' آپ کے تعلق پر تو پوری دنیا کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اغیار کو آپ کے تعلق پر فخر تھا پھر بھلا اہل خاندان سے کون ایسی جرأت کر سکتا تھا۔ حکیم صاحب کو عزت کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ مولوی اسماعیل اپنی ریڑھی پر باہر بیٹھا آپ کی صحت کیلئے گڑ گڑا کر دعائیں مانگ رہا تھا۔ آپ نے کس محبت کے ساتھ اس کو بھیک مانگنے سے منع کیا تھا حالانکہ وہ دونوں ٹانگوں بلکہ جسم کے نچلے مفلوج دھڑ کے ساتھ سڑکوں پر گھسٹ کر بھیک مانگا کرتا تھا۔ آپ نے نہ صرف اس کیلئے ریڑھی کا بندوبست کیا بلکہ اپنے ہوٹل کے باہر اس کو ایک چھوٹا سا ''کھوکھا'' سامان کے ساتھ لگوا دیا کہ محنت کے ساتھ رزق کماؤ حالانکہ آپ کو اس جگہ کیلئے کئی دفعہ ہزاروں روپے کی آفر بھی ہو چکی تھی۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ یہ میرا عمل میری عقبیٰ و آخرت کی نجات کا وسیلہ بن جائے۔

آپ کا برسوں سے دستور تھا کہ علی الصبح فقیروں اور محتاجوں کی ایک لمبی قطار کیلئے ہوٹل سے روزانہ چائے اور ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا اور اس عمل کو اپنے فرضِ منصبی سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ ملازمین کو سختی سے ہدائت تھی کہ اس عمل میں کوئی سستی اور بداخلاقی کا اظہار نہ کرے۔ پھر ملازمین سے بھی اولاد جیسی شفقت اور محبت تھی۔ کشمیر سے محبت کا ایک ایسا اعلیٰ ثبوت کہ تمام ملازمین جن کا تعلق بھی کشمیر سے تھا برسوں سے کام کر رہے تھے' گویا اپنا ایک چھوٹا سا کشمیر بسائے بیٹھے تھے۔ شہر کے شرفاء' دانشوروں اور علماء سے دوستی کا یہ عالم کہ میلوں دور سے ان حضرات کی روزانہ آمد پر محفل سجائی جاتی تھی جہاں شہر کا مقامی مسئلہ ہو یا قومی سیاست کا' اس میں بھرپور اجتماعی دلچسپی اور شرکت فرماتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قومی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کا بھی از حد احترام تھا مگر ایوب خان کی حمائت محض اس لئے کہ اسلام میں عورت کو گھر کی حکمرانی کا درس دیا گیا' حالانکہ ہم سب محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی کیلئے دعا گو تھے۔ ایک دفعہ اہلیہ جو کہ سیاست کے حرفِ ابجد سے بھی واقف نہیں تھیں' محض عورت ہونے کے ناطے محترمہ فاطمہ جناح کی حمائت میں کچھ ہمدردی کے الفاظ کہہ ڈالے' بس پھر کیا تھا کہ جہیل کا میٹھا پانی کچھ لمحوں کیلئے تو کڑوا ہو گیا لیکن فوری اپنے اس رویہ پر معذرت کرتے ہوئے دلجوئی فرما دی۔

علمائے دین کا از حد احترام اور ان کی مجالس میں بیٹھنا باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔ جہاں مولانا صدیق صاحب سے مراسم تھے وہاں صاحبزادہ فیض الحسن سے بھی یاد اللہ تھی۔ مفتی سید سیاح الدین کاکاخیل سے تو خصوصی محبت تھی۔ مجلسِ احرار کے ناطے صاحبزادہ فیض الحسن کی خطابت کے بھی بہت معترف تھے۔

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے

غالب بے مثال کی صورت

بات پھیل گئی مگر یادیں بدستور پرے جمائے صف در صف کھڑی ہیں۔ کس کو لوں اور کس کی چھوڑوں! مجھے اس بات کا تو علم ہے کہ محبت کے پھول آنکھوں کے گملوں میں ہوتے ہیں جو پلکوں کی حفاظت میں سینچے جاتے ہیں لیکن برسوں کی فصل پک کر آج ان صفحات پر جمع ہو رہی ہے۔ شائد ایسا آج بھی نہ ہوتا اگر یہ ۳۱ دسمبر کا دن انمٹ نقوش لئے مطالبہ اور تقاضہ نہ کرتا۔

دراصل دکھوں کے چراغ جب انسان اپنی ہتھیلی پر لیکر پھرتا ہے تو اس کا اجالا چہرے پر سہانی یادوں کے داغ نمایاں کر دیتا ہے اور پھر بعض اوقات انسان محبت میں ایک تماشہ بن جاتا ہے لیکن اگر یہی دکھ کا چراغ چھپ کر دل میں جلایا جائے تو اس کی روشنی سے روح روشن اور مہک اٹھتی ہے۔ پھر انسان دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً پچھلی چار دہائیوں سے زائد آپ کی یادوں کے چراغوں کی لو دھیمی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی!

اندر بھی زمیں کے روشنی ہو

مٹی میں چراغ رکھ دیا ہے

میں جانتا ہوں آپ کیوں اور کہاں چلے گئے ہیں اس کے باوجود کم و بیش ہر روز اپنے دل میں ایسے ان گنت سوالات کلبلاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ اب تو آپ کے ہاں اڑوس پروس میں کئی اپنے ہی چلے آئے ہیں۔ ایک طرف ماں کی محبت کو پہلو میں لٹار کھا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی رفیقہ حیات کو بھی بلار کھا ہے۔ جہاں تایا جان اور چچا جان اس محفل میں شریک ہیں وہاں نوجوان بیٹے اعجاز ملک اور احسان ملک بھی آپ کے ساتھ محفل سجائے تشریف فرما ہیں۔

معشوق ریاض اٹھ گئے اس بزم سے کیا کیا

جاتی ہوئی دنیا ہے رہے نام خدا کا

مجھے آپ کی کہانی سنانے کا ناصحانہ انداز اچھی طرح یاد ہے کہ کس حکمت و دانائی کے ساتھ ہمارے دلوں میں مطلوبہ نصیحت گھر کر جایا کرتی تھی۔ آپ نے کبھی بھی اپنی غریب الوطنی کے مصائب کو نہیں چھپایا بلکہ ہمیشہ اس کو عبرت کے انداز میں یاد بھی رکھا اور ہمارے دلوں میں بھی اتارا۔ پاکستان کو ایک معجزاتی ریاست اور جان سے زیادہ عزیز رکھنے کی تلقین کی کہ دنیا میں اس سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں جو لاکھوں جانوں کی قربانی اور ایثار سے حاصل کیا گیا۔ شب و روز کی محنت نے زندگی کے تمام انعامات سے نواز رکھا تھا لیکن کشمیر کی یاد اکثر آبدیدہ کر دیتی تھی۔ ہم سب کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کنبہ پروری میں اپنی مثال آپ تھے۔ توفیقِ ایزدی سے جب گھر بنوایا تو خاندان کے کئی بے گھر افراد کو گھر کے ایک حصے میں رہنے کی تمام آسائشیں مہیا فرما دیں۔ آپ کی ساری عمر کوشش رہی کہ کسی بچے کی جائز خواہش "حسرت" نہ بن جائے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ "کاش ! ایسا ہوتا۔" آپکو یہ سننا پسند نہ تھا۔ خود بھی قناعت برتی اور عملاً اس کی تلقین بھی کی۔

ایک مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات میں اسکول کے طلباء کا ایک گروپ مطالعاتی سیر کیلئے سوات اور گلگت کیلئے تیار ہوا، میں نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ آپ سے اجازت مانگی تو آپ نے بڑے اصرار کے بعد اجازت تو دے دی لیکن کیا دیکھتا ہوں کہ آپ مجھے رخصت کرنے کیلئے خود ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے آئے اور علیحدگی میں میرے ہیڈ ماسٹر جناب ذکاءاللہ صاحب اور دوسرے اساتذہ کرام سے کافی دیر محو کلام رہے۔ یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ ایک خاصی رقم زادِ راہ کیلئے خاموشی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کے حوالے کر دی کہ میری کسی خواہش کو حسرت میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے۔ پھلوں کے کئی ٹوکرے بھی ساتھ لائے جس سے تمام طلباء ساتھی بھی خاصے لطف اندوز رہے۔ جب مہینہ بھر کی سیر سے واپس پہنچا تو گھر والوں سے معلوم ہوا کہ آپ نے ہر شب خصوصاً پھل کھانے کی مجلس میں بہت یاد فرمایا بلکہ بے تابی کا یہ عالم تھا کہ میں نے جو خطوط لکھے تھے ان کو دن میں کئی مرتبہ سنتے تھے۔ میں نے اس سفر میں "سواتی سٹائل" کی ایک ٹوپی خریدی جو آپ نے میری دلجوئی کیلئے کئی دن اوڑھے رکھی حالانکہ مجھے علم تھا کہ آپ ہمیشہ قراقلی ٹوپی استعمال فرماتے تھے۔

خواب بن کر رہ گئیں ہیں کیسی کیسی محفلیں
خیال بن کر رہ گئے ہیں کیسے کیسے آشنا

اپنی والدہ کی دلجوئی کا کس قدر خیال تھا۔ ساری عمر آپ کے پاس قیام رہا حالانکہ دوسرے بچوں کے گھر بھی قریب تھے ۔ ایسی بے مثال محبت 'ایک دفعہ سردیوں میں ان کیلئے ایک گرم چادر سو روپے میں خریدی 'گھر میں والدہ کی خدمت میں پیش کی تو والدہ نے فوراً محبت میں اوڑھ لیا۔ ان کے دل میں نجانے کیا آیا کہ انہوں نے اس گرم چادر کی قیمت پوچھ لی۔ آپ کافی ٹال مٹول سے کام لیتے رہے لیکن بالآخر جب بتانے پر مجبور ہو گئے تو انتہائی غیر معمولی قیمت محض اس لئے بتائی کہ اصل قیمت سن کر والدہ فضول خرچی گردان کر ناراض نہ ہو جائیں۔

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں

بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کیلئے

آپ کی بڑی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرونِ ملک کا سفر کروں۔ اس کیلئے اپنے قریبی دوست محمد حنیف صاحب کو بسترِ مرگ سے تلقین بھی کی۔ میں بھی سن رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی اس خواہش نے مجھے بے شمار رکاوٹوں کے باوجود سہارا دیئے رکھا اور اب ایک ایسا وقت بھی آیا کہ آدھی سے زیادہ دنیا کی سیاحت کر چکا ہوں لیکن پھر بھی ہر سال کوئی نہ کوئی بیرونی سفر انتظار میں رہتا ہے۔ آپ تو اپنے ہر تعلق رکھنے والے کے دل میں اپنی بے پناہ یادیں چھوڑ کر اپنے محبوب رب کے ہاں حاضر ہو گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ موت کوئی نئی چیز نہیں'اس کا ذائقہ تو ہر کسی نے چکھنا ہے' موت کے قانون سے نہ تو کوئی نبی مستثنیٰ ہے نہ ولی'جو بھی آتا ہے اپنا مقررہ وقت پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے'کسی کا حالتِ ایمان میں اس دنیا سے رخصت ہو جانا اس کے حق میں ایک بڑی نعمت ہے۔ پھر اس دنیا میں آنا ہی درحقیقت جانے کی تمہید ہے مگر بعض جانے والے اپنی دائمی جدائی کا ایسا غم دے جاتے ہیں جو بڑا ہی جانکاہ اور ہوشربا ہوتا ہے بلکہ اس صدمے سے سنبھلنے میں عمر صرف ہو جاتی ہے۔ آخر آپ بھی تو اپنی والدہ محترمہ کا تین مہینے سے زائد انتظار نہ کر سکے۔

ہے رشک اک جہان کو جوہر کی موت پر

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بعض لوگوں کے جانے کی اطلاع پڑوسی کو بھی نہیں ہوتی'اگر ہو بھی جائے تو دو چار آنکھوں کے علاوہ ان پر رونے والا کوئی نہیں ہوتا'بعض لوگوں کے جانے سے دو چار خاندان غمزدہ ہوتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے جانے سے ایک عالم غمگیں اور اندوہگیں ہو جاتا ہے'جس تک بھی خبر پہنچتی ہے اس کی چشم نم اور دل غم سے لبریز ہو جاتا ہے۔ جن کے رخصت ہونے سے محبت والفت کی مسند سونی ہو جاتی ہے'پیار و شفقت کی بساط الٹ جاتی ہے'پورا کنبہ ان کی دعاؤں اور برکات و توجہات سے محروم ہو جاتا ہے۔

آپ کی موت ایک انسان کی موت نہیں بلکہ ایک عمل کی موت ہے جس کا خلاء ابھی اور برسوں رہے گا۔ آپ کی موت تو ایک انکساری و تواضع کی موت ہے'شرافت و نجابت کی موت ہے'شفیق باپ'محبت کرنے والے شوہر اور پر خلوص رفیق کی موت ہے۔ ایک ایسے عظیم انسان کی موت ہے جن کے نقشِ پا سے زندگی راستہ ڈھونڈتی ہے۔ ایک ایسے بلند پایہ خلیق باپ کی موت ہے جس سے محبت کا ایک باب مکمل طور پر بند ہو گیا ہے۔ آپ کے دل کی دھڑکن نے بند ہو کر سینکڑوں دلوں کی دھڑکن کو بری طرح پامال کیا ہے۔ آپ ہمارے لئے پند و نصائح کا مینارہ نور تھے جس کی روشنی میں مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ہمت عود کر آتی تھی۔ آپ خود شمع کی مانند پگھل کر اک جہاں کو روشنی مہیا کرتے تھے۔ دنیا کی سخت دھوپ میں نہائت فرحت بخش سایہ بن کر ہر کسی کے سر

پر موجود تھے 'خود بے قرار ہو کر ہر کسی کو سکون کی دولت تقسیم کرتے رہتے تھے۔ بولتے تو منہ سے ایسے انمول موتی جھڑتے کہ ہر کسی کو سمیٹنے میں اپنی جھولی تنگ نظر آتی۔ اگر خاموش رہتے تو وقار وسکینت کا اعلیٰ نمونہ ہوتے تھے۔ کس کس خوبی کا ذکر کروں اوراب کس کس محرومی کی نشاندھی کروں' گویا اب تو تپتی دھوپ میں ان سنگلاخ پتھروں پر ننگے پاؤں چلنے کی بھی ایک عادت سی ہو گئی ہے۔

غم مختلف شخصیتوں پر مختلف انداز میں اثرانداز ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں پہ غم کی خبر بجلی کے کرنٹ کی طرح گرتی ہے' کچھ لوگوں پر غم کا دھارا اچل کر انہیں بھگو دیتا ہے' کچھ لوگ غم کی خبر سن کر خالی الذہن ہو جاتے ہیں' پھر غم بوند بوند گرتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو بھی جب منوں پھولوں میں سجا ہوا دیکھا تھا تو دفعتاً میں خالی الذہن ہو گیا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب غم بوند بوند گرے گا' گرتا رہے گا' میرا سب سے بڑا محسن جو چلا گیا تھا۔ میری زندگی کا سب سے بڑا مشاہدہ' وہ جو مجھ پر اللہ کی عظیم ترین کرم نوازی تھا' جس کے جانے کے بعد میں بالکل اکیلا رہ گیا' جیسے کسی مٹی کے پیالے سے دودھ نکال لیا جائے اور اب صرف خالی برتن رہ جائے!

آپ تو ایک عطیہ خداوندی تھے جس سے ہم سب استفادہ کرتے رہے اور اب اللہ نے آپ کو واپس بلا لیا ہے۔ آپ نے سفر آخرت کیلئے بھی کیسا دن پایا۔ جمعۃ المبارک کی نماز پڑھ کر ہم سب تیزی سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ مسلسل ایک گھنٹہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی رفیقہ حیات کو دنیا کی گرم سرد ہواؤں کا مقابلہ کرنے کی نصیحتیں فرماتے رہے' بڑی عاجزی کے ساتھ اپنے معاملات کی صفائی طلب کرتے رہے' آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر بڑی بے بسی سے دعا کی۔

"اے غفور الرحیم! اپنے کھوٹے اعمال کے ساتھ تیرے دربار میں تیری رحمت کا امیدوار بن کر حاضر ہو رہا ہوں، اگر تو معاف کر دے تو کوئی بڑی بات نہیں، دنیاوی سفر بھی زادِ راہ کے بغیر تیرے سہارے طے کیا ہے اور اب بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔" علامہ اقبال کی یہ رباعی دہراتے رہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر

روز محشر عذر ہائے من پذیر

گر تو می بینم حسابم نا گزیر

از نگاہ مصطفی پنہاں بگیر

کمرے میں موجود افراد کو گواہ بنا کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔ **انا اللہ وانا الیہ راجعون**

اداسی جو ایک سیاہ بادل کی طرح میرے دل میں اترتی چلی جا رہی ہے' نیچے ہی نیچے...... نیچے ہی نیچے' میں دل تھام کر ان کیلئے دعا کرتا ہوں کہ:

اے غفور الرحیم! آپ رب ہیں ہم عبد ہیں' آپ مسجود ہیں ہم ساجد ہیں' آپ دینے والے ہیں ہم لینے والے ہیں' آپ رحمٰن ہیں ہم طلبگار ہیں' غلطیوں سے در گزر فرما اور والدِ محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرما۔ آمین

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر

(والد محترم کی ۳۵ویں برسی کے موقع پر)

# اک آفتاب بھری دوپہر میں ڈوب گیا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

اب جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

مجھے وہ لمحہ کبھی نہیں بھول سکتا......!زندگی کے آخری سانس تک بھی نہیں'ایک ایک لمحے کی کیفیت میرے دل پراور ایک ایک پل کی کیفیت میری آنکھوں میں محفوظ ہے۔

میں سیڑھیوں کے اوپر جنگلے کے پاس کھڑا ہوں جہاں نیچے دالان اور پورا صحن نظر آرہا ہے۔دوپہر کا آغاز ہو چکا ہے۔موسم میں کافی خنکی ہے'آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں گویا اہل زمیں پر سایہ ربی ہے۔وقت کا اندازہ نہیں لگا سکتا حالانکہ گھڑی کلائی پر بندھی ہوئی ہے۔وقت کی رفتار کو روکنا چاہتا ہوں لیکن بے سود......!یہ نہیں بتا سکتا کہ مجھے یہاں کھڑے کتنی دیر ہو گئی ہے'لگتا ہے کئی دن اور کئی راتیں میرے قریب سے دبے پاؤں چپکے سے گزر گئی ہیں اور میں یہاں نجانے کیوں کھڑا ہوں' وقت سے بے خبر'دیوار سے لگ کر ایک ہی رخ ایک ہی انداز میں۔میں جب سے یہاں کھڑا ہوں مجھے کہیں بھی کوئی روشنی نظر نہیں آرہی' ہر سو گھپ اندھیرا'خوف سے دل بیٹھا جارہا ہے'ٹانگیں کانپ رہی ہیں اور ہاتھ ٹھنڈے پڑتے جارہے ہیں کہ دفعتاً میرا چچازاد بھائی ککو بشارت آنسوؤں سے تر چہرہ لئے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے نیچے آنے کو کہتا ہے کہ "آؤ لوگوں کا ہجوم باہر کھڑا ہے' سبھی مجھے تلاش کر رہے ہیں'بہن بھائیوں' عزیز و اقرباء کو دلاسہ دینے اور ہمت سے کام لینے کا وقت ہے'اب اس حادثے کی حقیقت کو تسلیم کئے بغیر کوئی چارۂ کار بھی تو نہیں۔

ہاں.....جی ہاں'بڑا ہی جانکاہ حادثہ رونما ہو چکا تھا'صحن میں عورتوں کو بہت بڑا ہجوم'آہ و زاری میں مبتلا'آسمان تک شور کی آوازیں' مجھے دیکھ کر یک بیک کئی دلدوز چیخیں گونج اٹھی ہیں۔سسکیوں اور نالوں کی آواز ہر سو پھیلی ہوئی ہے۔میں بے اختیار ایک عالم بے بسی میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں'یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں تنہا ایک غرق شدہ جہاز کے تختہ پر بیٹھا ہوں'یہ تختہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں میں بری طرح گھر چکا ہے' مجھے یہ کہاں پہنچائے گا'میں اس سفر کے بعد کسی مقام پر پہنچ جاؤں گا'مجھے کوئی علم نہیں..... بالکل کوئی علم نہیں!میں کس طرح صحن میں کچھ دیر کیلئے ٹھہرا'کون سی غیر مرئی قوت نے مجھے سہارا دے رکھا تھا'کون کون مجھ سے تعزیت کر رہا ہے'کچھ خبر نہیں'بس مجھے یہ دکھائی دے رہا تھا کہ سامنے میری ماں سفید براق چادر میں اپنا فانی وجود لپیٹ کر ہمیشہ کی میٹھی نیند سو رہی ہے۔

سب بہن بھائی'عزیز و اقارب پلنگ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں'ایک کثیر تعداد نے ان سب کو گھیر رکھا ہے۔مجھے آگے جانے کیلئے سب نے راستہ دیدیا۔دل میں جو ایک طوفان برپا تھا خیال تھا کہ ابھی سینہ شق ہو جائے گا'دل ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا لیکن

اسی لمحے ماں کے مسکراتے چہرے نے گویا ایک ایسا اشارہ کیا جس کو صرف میں ہی دیکھ اور سمجھ پایا تھا' ایک سرگوشی کے عالم میں گردن جھکانے کا حکم دیا' جونہی میں نے اپنا کان ان کے منہ کی طرف بڑھایا تو ماں جی نے دائمی جدائی کا پیغام سنا ڈالا۔ طوفان آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہہ اٹھے' گرد و پیش میں رونے کی آوازیں اب مسلسل بلند ہونا شروع ہو گئیں' میں دم بدم پہلو بدلتا رہا' یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہوں' ارد گرد ایک نظر دوڑائی' ہر کوئی مجھ سے بڑھ کر بے چین اور غم زدہ دکھائی دے رہا ہے' ہر کوئی اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہے' ہر ایک اپنا رشتہ تھامے میری ماں سے جواب طلب کر رہا ہے لیکن ماں جی جو اس سفید چاندنی کے نیچے بے خبر آرام فرما رہی ہیں' ان سب سے لاتعلق اپنی ایک نئی اگلی دنیا میں مگن گویا ایک عمر کے بعد ماں جی کو ایک ایسا سکون میسر آیا ہے۔

کئی بار ارادہ کیا کہ ماں سے پوچھوں "ماں جی! آپ تو کبھی ہمارے اس قدر پریشان ہونے پر اس طرح خاموش نہ رہتی تھی' آج خلافِ معمول یہ سکوت کیسا؟ آپ تو اپنی اولاد یا کسی بھی عزیز رشتہ دار میں سے کسی کو ذرا بھر بھی ملول دیکھتیں تو تڑپ اٹھتی تھیں مگر آج سب آپ کے ارد گرد آہ و زاری کر رہے ہیں' غیروں کے بھی آنسو نہیں تھم رہے لیکن آپ ان سے یہ بھی پوچھنا گوارہ نہیں کر رہیں کہ آخر معاملہ کیا ہے' کیا دکھ پہنچا ہے تمہیں' کس لئے تم سب رو رہے ہو؟؟؟ میں نے تو ساری عمر کسی کو کوئی دکھ نہیں دیا' ہمیشہ سب کی خدمت کی' سب کے آنسو اپنے دامن میں جذب کئے ہیں' پھر آج یہ معاملہ کیسا اور کیوں.....؟ آج اس گھر کے در و دیوار بھی غم زدہ اندوہگیں اور اداس ہیں جیسے وہ اس عظیم ہستی کو رخصت کرتے ہوئے چپ چاپ ہولے ہولے آنسو بہا رہے ہیں۔ آخر اس ہستی کے ساتھ زندگی کے طویل شب و روز گزارے ہیں' بڑا کٹھن راستہ مل کر طے کیا ہے۔

غالباً تیرہ برس کی عمر میں پیا کے گھر آباد ہو گئیں تھیں۔ نہائت صحت مند' مضبوط' طاقتور اعضاء اور خوبرو قد کی بدولت پورے خاندان میں متعارف تھیں۔ جب ان کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو نہیں جانتی تھیں کہ اب انہیں کس منزل سے زندگی کا سفر شروع کرنا ہے۔ آنے والے شب و روز اپنے اندھیروں اور اجالوں میں ان کیلئے کیا کچھ لیکر آئیں گے۔ نئے گھر میں آکر اپنے آپ کو کچھ ایسے اجنبی مگر محبت کرنے والے لوگوں کے درمیان پایا جو ایک مدت سے ان کے منتظر تھے۔ سب کے سب دنیاوی علوم سے بے بہرہ' پرانی روائتوں کے اسیر' ادھر ادھر دیکھے بغیر زندگی کی راہ پر چلنے والے سیدھے سادے معصوم۔ پھوپھی کی شکل میں ایک غم زدہ اور زمانے کی ستائی ہوئی ساس اور دو دیور' ایک جیٹھ بھی تھا لیکن مقامی حالات سے دل برداشتہ ہو کر وطن سے دور کسی نامعلوم مقام پر ڈیرہ لگائے بیٹھا تھا۔ چھوٹا دیور تو اولاد کی طرح تحفہ میں ملا۔ اس کی ساری پرورش اور سب کی خدمت شروع دن سے نصیب میں لکھی گئی۔ شوہر خوبرو' خوبصورت' وجیہ' طاقت و شرافت میں بے مثال' بس یہی کل کائنات کا سرمایہ۔ گھر کے معاشی حالات کی کفالت وہ زرعی زمین تھی جس کی نگرانی بیوہ ساس اور منجھلے دیور کے ذمہ تھی۔ شوہر نامدار تو اس ذمہ داری سے بری الذمہ تھے کیونکہ وہ اپنے علاقے کی سیاست اور مقامی مسائل کے حل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے۔ ساس پرانے زمانے کی عبادت گزار' زاہدہ و عابدہ عورت' لکیر کی فقیر' بہو سے یہ توقع کہ صبح سے لیکر شام تک بلکہ نیم شب تک سارا کام انجام دے' گھرداری بلکہ زمینداری

میں بھی پورا ہاتھ بٹائے۔

میری ماں جب اس گھر میں آئی تو انہیں پتہ چلا کہ ان کی پھوپھی یعنی ساس ماں جوانی میں رضائے الٰہی سے بیوہ ہو گئیں تھیں۔ابھی یہ صدمہ بھولا نہیں تھا کہ جوان اولاد جوان بیٹا بھی اپنے باپ کے پہلو میں آرام کرنے چلا گیا۔اکلوتی بیٹی تھی جو اپنی ماں کا غم بانٹتی تھی' وہ بھی چند دنوں کا بیٹا اپنی نشانی ماں کی گود میں چھوڑ کر اپنے مولا کے ہاں حاضر ہو گئی۔اب اس معصوم بچے کی شکل میں بیٹے کی پرورش برسوں کی۔جب یہ نشانی گھبرو جوان ہوئی تو اس نے بھی اللہ کے ہاں حاضر ہونے میں عجلت کی۔ٹھیک پندرہ دنوں کے بعد اکلوتا جوان پوتا جس کی شادی کو چند ماہ باقی تھا' وہ بھی خاندانی قبرستان کی زینت بن گیا۔اب تو اس بوڑھی زاہدہ وعابدہ عورت کے اعضاء شل ہو گئے ۔ان صدموں نے عمر سے پہلے چہرے کی لالی' شادابی اور مسرت چھین لی۔اب ان تمام صدموں کے واضح نشانات تھے جنہوں نے بڑھ کر میری ماں کا استقبال کیا۔

میری ماں سب سے پہلے بستر سے اٹھتیں' وضو کر کے اپنی ساس کی بغل میں ہی دوسرا مصلیٰ بچھا کر نماز فجر سے اپنے دن کا آغاز کرتیں' ذکراذکار سے فارغ ہو کر گھر کے کام کاج میں اس طرح مشغول ہو جاتیں کہ رات کی گہری سیاہی آڑے آکر ان کو بیٹھنے کا موقع فراہم کرتی۔شادی کے ڈیڑھ سال بعد اللہ نے گود ہری کر دی' بڑا خوبصورت بچہ اپنے پہلو میں دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو ابھی سوکھے بھی نہ تھے کہ ٹھیک چالیس دنوں کے بعد اللہ نے اس خوشی کو واپس بلا لیا۔صبر وشکر کا مجسمہ تو پہلے ہی تھیں' اب اس گھر کی سنت سمجھ کر اس کو بھی قبول کر لیا۔اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے دو بیٹیاں دیدی' ماں اب گھر کے کام کاج کے علاوہ ان کی پرورش بھی بڑے سلیقے سے کرنے لگیں کہ اچانک افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں' برسوں کا امن فسادات میں تبدیل ہو گیا' بالآخر وطن کا بٹوارہ ہو گیا۔اب اس ملک میں جہاں بچپن سے لیکر جوانی کا وقت گزرا تھا' اب دوسرا پل ٹھہرنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ماں نے اپنے سگھڑاپے سے جو گھر کی آرائش و زیبائش کی تھی اس سے بھی یکسر محروم ہونا پڑا' صرف تن کے کپڑوں کے علاہ کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی مہلت بھی میسر نہ آسکی۔ بالآخر کشمیر جنت نظیر کے کوہساروں' ندی نالوں اور اپنے آباؤاجداد کی تمام نشانیوں کو الوداع کہنا پڑا۔

نئی مملکت خداداد پاکستان میں مہاجر کا لیبل لگائے (لائلپور) فیصل آباد براجمان ہونا پڑا۔شدید غربت آڑے آئی' تنگ وتاریک گھر' شہر کا اجنبی ماحول' غیر مانوس در ودیوار' مقامی زبان سے مکمل ناآشنائی' ایک دفعہ پھر کڑی امتحان وآزمائش کا دور شروع ہو گیا۔یہی وہ ماہ وسال تھے جب اس مکان میں ایک کمرہ جسے "پرلا اندر" کہتے تھے' میں نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا۔اس گھر میں میری ماں کے علاوہ دوسرے تین مہاجر خاندان بھی آباد تھے' یعنی ایک کمرہ پورے خاندان کے حصے میں آیا ہوا تھا۔اب میرے پہلے سانس کا وقت ۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء نماز فجر سے کچھ دیر پہلے کا مجھے بتایا گیا کہ والد محترم مسجد میں نماز کیلئے تشریف لیجا چکے تھے' مسجد میں ہی ان کو میری آمد کی اطلاع پہنچائی گئی جہاں مسجد کے چند آشنا نمازیوں سے مبارکباد وصول کر کے فوری گھر تشریف لائے۔میں کبھی کبھار تخیل میں

پرواز کرتا ہوا یہ سوچتا ہوں کہ یہ گھڑی ایسی ہوگی جب فضا میں سورج چمک رہا ہوگا یا غروب ہو رہا ہوگا یا پھر یہ وقت رات کا کوئی پہر ہو گا جب وقت کے بیکراں افق سے خوشی کی کوئی کرن پھوٹی ہوگی جس نے میرے ماں باپ کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیری اور میں اپنے ماں باپ کی زندہ آرزو کی شکل میں ان کی گود میں ڈال دیا گیا۔

میرے ماں باپ نے مجھے بتایا کہ ایک بہت ہی بڑے آدمی نے میرے کان میں اذان دی اور میرے ہونٹوں سے شہد لگایا تھا' یہ شائد اس لئے کہ باقی عمر بار بار زندگی کے زہر آلود قطرے میرے حلق سے نیچے اترنے والے تھے۔ جب میں بچہ تھا تو میں کئی مرتبہ اپنی ماں کو آٹا گوندھتے یا کسی کمرے میں جھاڑو دیتے ہوئے اس عالم میں دیکھا کہ یکلخت وہ اپنے ہاتھ روک کر اوپر ٹکٹکی باندھے اللہ سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کر رہی ہے اور پھر اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں کو پونچھ کر اپنے کام میں دوبارہ مشغول ہو جاتی تھی لیکن بھیگی آنکھوں کے کونے مجھے وہ سب کچھ بتا دیتے تھے جو ماں ہمیشہ مجھ سے محض اس لئے چھپاتی تھی کہ میں کہیں پریشان نہ ہو جاؤں۔

ایسے میں یقیناً انہیں وہ خواب یاد آتے ہونگے جو انہوں نے اپنے پیا کے گھر آنے سے پہلے اپنی آنکھوں میں بسائے تھے۔ اپنے خوابوں میں خوش شکل' خوش لباس شوہر کو دیکھا ہوگا' اچھی آمدنی اور گھر میں خوشحالی کے بارے میں سوچا ہوگا' ایک خوبصورت کشادہ مکان کا نقشہ بھی خیالوں میں بسایا ہوگا اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے صبر کا وافر پھل بھی عنائت فرمایا' دنیا کی تمام نعمتوں سے انہیں سرفراز بھی فرمایا لیکن اپنی ماں اور بھائیوں کی جدائی کو بری طرح محسوس کرتے ہوئے بہت پریشان رہتی تھیں جو کشمیر کے دوسرے حصے میں مقیم تھے جہاں دو ملکوں میں کشیدگی اور تقسیم کی بناء پر ان سے ملنے کی کوئی سبیل نہیں تھی اور ان حالات میں ان کی خاموش آنکھوں سے جاری آنسوؤں کا اندراج اللہ کے حضور درج ہوتا رہتا تھا۔

اس وحشت انگیز فضا میں میری ماں کے ہونٹوں پر اس دن بڑا بھرپور تبسم رقص کناں تھا جب وہ مجھے پہلے دن اسکول روانہ کر رہی تھی۔ میری ماں کو اس دن کا بہت انتظار تھا' یہی وجہ ہے کہ مجھے چار سال کی عمر سے بھی کچھ پہلے اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا۔ مجھے اس لمحے کی شفقت اور ان کے ہاتھوں کا لمس آج بھی یاد ہے۔ مجھے بہت ہی خوبصورت اجلے لباس میں تیار کر کے میرے گلے میں ایک چھوٹا سا بستہ ڈال کر ایک ننھی سی تختی میرے ہاتھ میں تھما دی گئی تھی۔ رخصت کرنے سے پہلے اپنے دوپٹے کے ایک کونے کی گرہ کھول کر دو پیسے نکالے' میرا ماتھا چوما اور پیسے ہاتھ میں تھما دیئے اور بڑی محبت سے فرمایا:

"سمیع کوئی گندبلا نہ کھانا" میں نے اثبات میں سر ہلایا' وہ پھر میرے ساتھ گھر کی سیڑھیوں تک آئیں اور ایک دفعہ پھر وہی تاکید کرتے ہوئے گھریلو ملازم کو بھی نصیحت کی کہ راستے میں سائیکل' تانگے گھوڑے سے بچ کر چلنا۔ گلی کا آدھا راستہ طے کر کے جونہی موڑ مڑنے لگا تو دیکھا تو میری ماں دروازے پر ہی کھڑی تھیں اور ان کے ساتھ خادم ڈرائیور کی بیوی کے علاوہ دوسری عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ میری ماں نے یقیناً انہیں بتایا ہوگا کہ اس کا بیٹا پہلے دن اسکول جا رہا ہے۔

مجھے اسکول سے آتے جاتے میری ماں بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں' ان نظروں کی کیفیت میں اس وقت کم عمری کی وجہ

سے کبھی نہ سمجھ سکا لیکن کئی سالوں کے بعد اس مسکراہٹ و فخر و انبساط نگاہوں کا معمہ حل ہوا کہ ان کے بچے نے جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم کی روشن دنیا میں قدم رکھا تھا اور پورے خاندان میں سب سے زیادہ فخر سمیٹنے کی فکر بھی میری ماں کو لاحق تھی۔ علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود علم کیلیئے ان کے دل میں بڑا احترام تھا۔ میری تختی اور بستے کا اس قدر خیال جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صبح فجر کی اذان سے قبل ہی اپنا بستر چھوڑ دیتی تھی۔ وضو کر کے گیلے ہونٹوں کے لمس کے ساتھ ہم سب بہن بھائیوں کو اٹھایا جاتا' نماز کا باقاعدہ اہتمام ہوتا' ہمارے ساتھ قرآن کریم رحل میں لیکر بیٹھ جاتیں۔ دعا مانگ کر قرآن مجید جزدان میں لپیٹ کر ایک لمبی دعا مانگنا شروع کر دیتیں اس وقت تک آنکھیں بند رہتیں جب تک دعا مکمل نہ ہو جاتی' گویا رب کے ہاں عملاً اشک بار ہو کر ہم سب کی سلامتی و ترقی کی دعائیں مانگ کر اپنے پلو سے آنکھیں صاف کر کے یکے بعد دیگرے سب بچوں کے منہ پر ضرور بالضرو پھونک مارتیں' وہ سمجھتی تھیں کہ اس طرح وہ اپنی اولاد کو طویل زندگی اور اللہ کی حفاظت میں سونپ رہی ہیں۔

ماں جی کو اپنے ہر بچے کا بہت خیال رہتا تھا' اس کے کھانے پینے' اس کے کپڑے لتے کی صفائی ستھرائی کا اور حتیٰ کہ جوتوں کی پالش کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ کوئی بچہ معمولی سا بھی بیمار ہو جاتا تو ان کی جان پر بن آتی' جب تک وہ مکمل صحت یاب نہ ہو جاتا اس کے بستر کے ساتھ لگ کر بیٹھ جاتیں۔ سردیوں میں ہر روز رات کو سونے سے قبل ہر بچے کے منہ پر خود اپنے ہاتھوں سے ویسلین لگانا' آنکھوں میں سرمہ ڈالنا ایک معمول تھا اور یہ سرمہ بھی گھر میں بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ تیار کیا جاتا بلکہ اس کی شہرت تو پورے محلے بھر میں تھی اور اس کو باقاعدہ تقسیم کا عمل بھی جاری رہتا۔ انہوں نے ساری زندگی اپنے لئے کچھ طلب نہ کیا۔ گھر کے سب افراد کو کھانا کھلا کر جو کچھ بھی بچ جاتا اس سے پیٹ بھر لیتیں۔ ناشتے میں گھر والوں کو تازہ پراٹھے اور پڑھنے والے بچوں کو باداموں والے دودھ کے ساتھ گھی کی ''چوری'' ملتی اور خود رات کی روٹی کو پانی میں گیلا کر کے توے پر ڈال کر اپنے لئے پراٹھا تیار کر لیتیں' اور اپنے لئے یہ اہتمام وہ اس طرح کرتی تھیں جیسے یہ بھی کوئی روزمرہ ہی کا کوئی معمول ہے۔ دراصل ہماری تربیت کیلئے یہ مشق جاری رہتی کہ رزق کا احترام ہر حال میں بہت ضروری ہے۔

محلے بھر کی کئی خواتین کا تانتا بندھا رہتا' سب کے دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔ جب کوئی خاتون اپنے گھر کے کسی دکھڑے کا ذکر کرتے ہوئے رونا شروع کرتی تو اس کو حوصلہ دیتے وقت خود بھی بہت اشک بار ہوتیں۔ پڑوسن سمجھتی کہ میری ماں بھی اس کے غم میں برابر کی شریک ہے' اسے کیا خبر کہ میری ماں کا بھی کوئی اپنا غم ہے' اپنا دکھ بھی ہے جس کا اظہار وہ صرف انہی آنسوؤں کی صورت میں ادا کرتی ہیں۔ میری ماں آٹھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور یہاں پاکستان میں اس کے صرف دو بھائی موجود تھے جو وطن کے بٹوارے میں میری ماں کے ساتھ ہی پاکستان میں آ گئے تھے۔ وہ جب بھی گھر میں آتے' میری ماں ان کی خوب خاطر تواضع کرتی جیسے اپنی زندگی سے بالکل مطمئن ہے، ہر طرح سے خوش ہے۔ جب میرے اندر سوچنے سمجھنے کا کچھ شعور بڑھا تو میں کبھی کبھی یہ خیال

کرنے لگا کہ میری ماں یا تو بالکل بے حس ہو چکی ہے کہ کسی بھی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی یا پھر ان کا دل ایک ایسا سمندر بن گیا ہے جس میں جو کچھ بھی ڈالا جائے وہ فوری طور پر چپ چاپ نیچے گہرائیوں میں پہنچ جاتا ہے اور سطح ویسی کی ویسی رہتی ہے۔

بوڑھی ساس صدموں سے نڈھال اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھیں 'ان کی بچوں سے زیادہ دیکھ بھال ہوتی تھی۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری ماں اس ماحول کی گھٹن سے اپنا ذہنی توازن برقرار رکھے ہوئے اس سارے کنبے کی دیکھ بھال میں دن رات مصروف رہتی تھی۔

کبھی کبھار تو میں اپنی ماں کی بے بسی یا بے حسی پر کڑھ کر اکیلے میں بہت رویا کرتا تھا 'دعا کیا کرتا تھا کہ یا اللہ اگلی نمودار ہونے والی صبح کو مجھے اس قابل کر دے کہ میں اپنی ماں کے ان دکھوں کا مداوا بن سکوں لیکن ہائے افسوس ! ایسا بہت دیر سے اور بہت کم وقت کیلئے ہوا۔

میری ماں گھر میں ہر شخص کی خدمت اس انداز میں کرتیں جیسے وہ کوئی بہت خوشگوار ذمہ داری سر انجام دے رہی ہیں گویا ان کا حق اپنا لوٹا رہی ہیں۔ ہر ایک کو بڑی اہمیت دے رہی ہیں اور یہ اسی اہمیت و محبت کا تقاضہ ہے کہ وہ کبھی اپنی بوڑھی ساس کی دیکھ بھال کو ایمان سمجھتی ہیں اور کبھی گھر کے دوسرے افراد کے حقوق کی خاطر دن رات تج رہی ہیں۔ انہی کی دیکھ بھال اور سخت محنت نے بوڑھی ساس جو کہ ان کی پھوپھی بھی تھی چند سالوں کے بعد صحت یاب ہو گئیں اور اپنی نارمل زندگی میں ان کی مثالی محبت کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے دوسرے بیٹے کے ہاں جانے کی نوبت آتی تو شام سے پہلے واپس لوٹ آتیں کہ کسی اور بیٹے کے گھر میں ان کا دل نہیں ٹھہرتا تھا۔ میری ماں نے کبھی بھی کسی سسرالی خاندان کی خدمت سے جی نہیں چرایا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اچانک مہمان آ گئے لیکن ایسا کبھی نہ ہوا کہ ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر رہ گئی ہو چاہے اس کیلئے بعد میں ان کو خود پیاز کوٹ کر روٹی کے ساتھ کھانے کو ملی ہو 'ان کا ایمان تھا کہ مہمان اللہ کی طرف سے رحمت اور رزق کی فراوانی کا سندیسہ لیکر آتا ہے۔ ''لیکن آپ کیوں پھر سوکھی روٹی کے ساتھ پیاز کوٹ کر کھا رہی ہیں '' میرے اس سوال پر بڑی محبت سے اسلاف کی مثالیں دیکر معاملہ کو ٹال دیتیں۔

گھر کے تمام افراد کے لباس کا خاص خیال رکھتیں 'ہر ایک کے تین تین چار چار جوڑے ٹرنکوں میں محفوظ ہوتے لیکن خود ان کے پاس دو جوڑے ہوتے ' ایک زیر استعمال ہوتا تو دوسرا کہیں اچانک باہر جانے کیلئے محفوظ رہتا۔ طبیعت میں بلا کی سادگی ' سخت سردی میں انہیں سویٹر پہننے کیلئے مجبور کیا جاتا تو تھوڑی دیر کے بعد یہ کہہ کر اس سے جان چھڑا لی جاتی کہ گھر کے کام کاج میں ہرج ہو رہا ہے ' ابھی فارغ ہو کر پہن لیتی ہوں لیکن رات گئے تک فراغت کہاں ؟ نچلی منزل سے دوسری اور تیسری منزل تک پانی لیجانے کی مشقت پر بھی

کبھی کسی سے کوئی شکائت نہیں کی۔ صفائی ستھرائی کا اس قدر خیال گویا واقعی صفائی نصف ایمان والی حدیث پر عملاً یقین۔ پاکیزگی کا یہ عالم کہ برتنوں کو کئی دفعہ مانجھا جاتا' ان پر کلمہ شہادت پڑھ کر پھونکا جاتا تو تب جا کر ان کے دل کو تسلی ہوتی' اور اس کے بعد کسی جالی دار کپڑے کے ساتھ تمام برتنوں کو ڈھانپ دیا جاتا۔ استعمال کے وقت دوباہ پانی سے کھنگال کر طہارت کی مہر لگائی جاتی۔

یہی حال لباس اور بدنی طہارت کا ہوتا تھا' کیا مجال ہے کہ کبھی گھر میں اکیلے میں بھی سر سے دوپٹہ اترا ہو یا کبھی ننگے سر کھانا پکایا ہو۔ اس کو وہ انتہائی شیطانی اور بے برکت عمل سمجھتی تھیں۔ میں نے انتہائی گرمیوں میں بھی ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں دیکھا اور کبھی بھی شکائت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی یہ تو عادت میں شامل تھا کہ کھانا پکاتے وقت کلمہ شہادت اور مسلسل درود شریف کا ورد کرتی رہتی اور ہمیشہ وضو میں رہتی کہ پتہ نہیں کب قضا کا فرشتہ آ جائے اور اس کام کی مہلت نہ ملے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے ان کے ہاتھوں کی نرمی میں بہت کمی واقع ہو چکی تھی حالانکہ گھر میں ملازمہ بھی موجود رہتی تھی۔ اس ملازمہ کا خیال بھی اس حد تک رکھا کہ اس نے بھی مرتے دم تک اس گھر کی چوکھٹ نہیں چھوڑی بلکہ اس کو گھر میں "ماسی" کا درجہ دیکر تمام امتیاز ہی ختم کر دیا۔

گھر میں سال بھر کیلئے گندم اور چاول کا اسٹاک کر لیا جاتا تھا۔ گندم اور چاول کی ستھرائی کیلئے کبھی کسی سے مدد طلب نہیں کی البتہ یہ دیکھا گیا کہ محلے کی کچھ مخصوص خواتین اکٹھی ہوتیں' کسی صاف فرش پر گندم یا چاول کی ستھرائی کا کام جاری ہو جاتا اور ساتھ ساتھ ان کی خدمت مدارت اور مہمان نوازی کا سلسلہ بھی' اس طرح وہ خواتین اپنے دکھوں اور غموں کا بوجھ بھی ہلکا کر لیتیں اور ماں جی جاتے ہوئے ان کے ساتھ ان کا حصہ بھی بطور تحفے کے ساتھ کر دیتیں۔ ہم سب بہن بھائی ان خواتین کو والدہ محترمہ کی "کابینہ" سے موسوم کرتے تو اس پر کبھی کبھی مسکرا کر لطف اندوز بھی ہوتیں۔ صبح سے لیکر شام تک اور بعض اوقات آدھی رات تک کام میں مصروف رہنا تو ایک معمول بن چکا تھا' ایسے میں کسی واضح تاثر کی نشاندہی ان کے چہرے سے نہیں ہو سکتی تھی' ہاں ان لمحوں میں ان کا چہرہ ضرور کھل اٹھتا جب ہم سب بہن بھائی امتحان میں اپنی کامیابی کی خبر سناتے' اس وقت ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھتا۔ جب ہم میں سے کوئی قرآن کریم ناظرہ مکمل پڑھنے کی اطلاع دیتا تو فوری کچھ خاص رقم مسجد کے تیل کیلئے روانہ کر دی جاتی جبکہ ہم سب بھائی یہ ضرور کہتے کہ اب تو مسجد میں برسوں سے بجلی کا استعمال جاری ہے لیکن ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں آتا۔ خصوصاً میرا پانچ سال کی عمر میں قرآن کریم ناظرہ پڑھ لینا تو ان کیلئے اللہ کا بڑا انعام تھا۔

میں نے انہیں کبھی بیمار ہوتے نہیں دیکھا۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انہیں علیل ہو کر چارپائی پر لیٹے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ سر میں درد ہوتا تو ایک رومال کس کر باندھ لیا جاتا' گویا سر درد کو کوئی سزا دی جا رہی ہو یا پھر کبھی کبھار اپنی ہی انگلیوں کی پوروں سے دباتی رہتیں۔ ایک دن مجھ سے دم پڑھنے کو کہا' مجھے کچھ اور نہ سوجھی فوراً آنکھیں بند کر کے چاروں قل' آیت الکرسی کے ساتھ درود شریف پڑھ کر پھونک ماری اور دل میں اپنے اللہ سے التجا کی کہ مجھ سے اس قدر محبت کرنے والی ماں کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی۔ اللہ کی کرنی کہ میری والدہ کا سر درد کیا ختم ہوا کہ میں سارے گھر میں اسی کام کیلئے مشہور ہو گیا بلکہ بعض اوقات یہ ذمہ داری مجھے

والدہ کی کابینہ کے ساتھ بھی نبھانی پڑتی۔ آج سوچتا ہوں کس قدر میرا رب کریم ہے کہ اس نے میری ہمیشہ لاج رکھی حالانکہ یہ سب تو ماں جی کی محبت اور یقین کا کمال تھا کہ دوا سے زیادہ دعا پر بھروسہ کرتی تھیں۔
گھر کے اخراجات میں سے پس انداز کر کے محلے کے غریبوں اور ناداروں کی امداد اس طرح کرتیں کہ واقعی دوسرے ہاتھ کو اس کا علم نہ ہوتا۔ کئی مرتبہ اپنے بھائیوں کی مالی امداد اس طرح فرمائی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ گویا حقوق العباد کا بھی پورا خیال۔ بڑی بیٹی کی شادی کی پھر بھی ساری عمر اس کی پرورش اپنے ذمہ رکھی۔ اس کی بڑی اولاد کو گھر کے افراد سے ممتاز کر کے ایسی پرورش کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ آخر ایک اور صدمہ بھی منتظر تھا۔ گھر سے بوڑھی ساس کا سایہ اٹھ گیا' گویا رحمتوں اور برکتوں کی ایک فیکٹری بند ہوگئی۔ ساری عمر جس کی ماں سمجھ کر خدمت کی' اسی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ سب لوگ وطن کی یوم آزادی کے سلسلے میں چراغاں کا اہتمام کر رہے تھے کہ گھر سے روشنی کا چراغ بجھ گیا۔ ابھی ان کی یادیں تازہ تھیں کہ وطن کو جنگ کے دھماکوں نے ہلا کر رکھ دیا۔ رات کو مکمل بلیک آؤٹ کا عالم ہوتا' یکایک سائرن کی آواز گونجتی کہ دشمن نے فضائی حملہ کر دیا ہے' اینٹی کرافٹ توپیں جب شعلے اگلتیں تو شہر کے در و بام اس طرح کانپتے جس طرح تنہائی میں گناہ گار کا دل کانپتا ہے۔ وہ سترہ دن بہت جذباتی گزرے۔
پھر مہاجرین کا سیلاب امڈ آیا۔ میرا ننھیال بھی کشمیر سے ہجرت کر کے پاکستان آن پہنچا۔ مجھے اس دن کا وہ انتہائی جذباتی منظر آج بھی یاد ہے جب میری ماں نے پورے اٹھارہ سال کے بعد اپنی ماں کو اچانک دیکھا۔ میری ماں پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی' پھر اچانک ماں سے گلے لگ کر رونا شروع کیا تو شادیٔ مرگ کی یہ کیفیت کئی گھنٹے قائم رہی۔ شائد یہ خوشی بھی پوری طرح راس نہ آئی کہ ٹھیک ساڑھے تین ماہ بعد شوہر کی دائمی جدائی کا صدمہ جھیلنا پڑ گیا۔

بیٹھے تھے گھنی چھاؤں میں اس کی خبر نہ تھی
بڑھ جائے گی دھوپ اور یہ سایہ نہ رہے گا

اک رفاقت اور محبت کا جو تاج محل تیار کیا تھا' اس طرح آناً فاناً مسمار ہو جائے گا' تیز گرم ہوا کے جھونکے سر کی چادر کو نشانہ بنائیں گے' زمانے کی دھوپ اس شدت سے دل کے آشیاں کو جلا کر راکھ کر دے گی' یہ تو میری ماں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اب ماں جی کا ایک دوسرا روپ شروع ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی کفالت کا بوجھ سر پر آن پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکہ میں ایک انتہائی منافع بخش ہوٹل کا کاروبار موجود تھا لیکن اعتبار کے ہاتھوں دھوکہ کھا گئیں۔ بالآخر تھک ہار کر مجھے ایک دن اس کام کو سنبھالنے کی دعوت دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ کمسنی میں بہت ہی تلخ تجربات کے بعد اس کاروبار کو نہ صرف سنبھال لیا بلکہ پہلے پانچ سالوں میں ہی اس کو پہلے سے زیادہ ترقی دیکر مزید منافع بخش کاروبار بنا دیا اور میری ماں کی بے بسی ایک دفعہ پھر خوشحالی میں بدل گئی۔ یقیناً اللہ کے فضل کے ساتھ ماں کی نیم شب دعاؤں کا بہت بڑا عمل دخل تھا لیکن میری ماں کو میری تھکا دینے والی ڈیوٹی پر بڑی تشویش رہتی کہ کم عمری میں کس مشقت اور عذاب میں مبتلا ہونا پڑ گیا لیکن میں اس بات پر خوش تھا کہ برسوں کی آرزو "ماں کی خدمت" کی تکمیل کیلئے اللہ نے

توفیق عنائت فرمائی۔اس کاروبار کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

بالآخر گھر کے فرائض یعنی بہن کی شادی سے بھی فراغت مل گئی اور اب ایک دن ایسا آیا کہ مجھے اپنی ماں سے اپنے مستقبل کیلئے ملک چھوڑنے کی اجازت کی درخواست دینی پڑی جس کو سن کر ایک لمحہ تو میری ماں سکتے میں آ گئی لیکن بالآخر کئی دنوں کی منت سماجت کے بعد یہ اجازت بھی مل گئی۔پہلے تین سالوں میں تعلیم کی تکمیل کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور کنسلٹنٹ انجینئر کی بہترین ملازمت کا بھی بندوبست ہو گیا۔اب میری ماں کو گھر میں بہو لانے کا بڑا ارمان تھا' اللہ نے وہ بھی پورا کر دیا اور سال بعد جب اللہ نے پوتے کی نعمت سے نوازا تو ایک عرصے کے بعد میں نے ان کو اس قدر مسرور پایا۔سارے شہر میں پوتے کی خوشی میں مٹھائی بانٹنے کا اہتمام فرمایا۔پہلی دفعہ جب پوتے کو گود میں لیا تو یہ فرمایا کہ میں نے آج ہی اپنے پالتو طوطے کو آزاد کر دیا ہے۔قسمت اب بھی کھڑی مسکرا رہی تھی گویا طنز کر رہی ہو کہ آج تک تمہیں اور کونسی خوشیاں راس آئیں ہیں۔اس خوشی کے ٹھیک ایک ماہ بعد سر میں اچانک شدید درد اٹھا کہ ہسپتال جا کر تھوڑی سی ہوش آئی۔ماں کو ساری عمر صدمے سہتے سہتے زندگی بھر کانٹوں پر سفر طے کرتی ہوئی آج جو ہسپتال پہنچی تو گویا اس نے اعلان کر دیا کہ اب تھک گئی ہوں۔

صیاد نے تیرے اسیروں کو آخر یہ کہہ کر چھوڑ دیا
یہ لوگ قفس میں رہ کر بھی گلشن کا نظارہ کرتے ہیں

ہسپتال میں پتہ چلا کہ دماغ کی شریان پھٹ گئی ہے۔میری ماں جس نے ساری عمر اطاعت' خدمت گزاری میں نبھا دی آج اس نے لمبی چپ سادھ لی۔ایک ہفتہ مسلسل کس طرح ہسپتال میں گزرا' یہ ایک لمبی داستان ہے۔وہ اعضاء جن کی طاقت و ہمت کی گواہی ایک زمانے نے دی آج ساتھ چھوڑ گئے۔وہ دل جو ہزاروں کیلئے دھڑکتا تھا' آج اپنی ذات سے بے وفائی کر گیا۔میری ماں جن کا سر میری گود میں تھا' آنکھیں کھولیں' آخری بار حسرت سے مجھے دیکھا' آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے نکلے جو بہہ کر تکئے میں جذب ہونا چاہتے تھے لیکن میرے دامن میں اس طرح محفوظ ہو گئے جیسے ماں نے آج پوری زندگی کا خراج ادا کر دیا ہو۔بشارت دوڑ کر ڈاکٹر کو بلا لیا لیکن ان کی آمد سے پہلے میری ماں نے کلمہ پڑھا' چہرہ اور گردن قبلے کی طرف اس طرح مڑ گئی کہ مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ چل سکا کہ میری ماں کی یہ مسکراہٹ آخری ہے جو میری آنکھوں کا بہترین سرمایہ حیات بن کر آج بھی میری یادوں کے گلشن کا ایک نمایاں گلدستہ بن کر میری زندگی کے گلستاں کو مہکاتی رہے گی اور یہ مجھے دنیا کے تمام خزائن سے عزیز ہے۔

**اناللہ وانا الیہ راجعون**

میری ماں آج اس دنیا میں نہیں' انہیں ہم سے رخصت ہوئے ۲۴ برس ہو گئے ہیں۔جب میں سوچتا ہوں کہ ماں جی کی کوئی ایسی قابل ذکر خدمت تو نہ کر سکا لیکن میری ماں نے میری گود میں سر رکھ کر سفر آخرت کا آغاز کیا۔میں تو ان کو خوشی کے چند سال ہی دے سکا تو میرا دل ایک انجانی مسرت سے تفاخر محسوس کرتا ہے' جیسے میرے دل کی سوگوار ویرانیوں میں ایک نغمہ شیریں گونج اٹھتا ہے

یا گرمی کی تپتی ہوئی فضا میں کہیں سے بادِ بہار کا ایک خوشگوار جھونکا میرے دل میں اتر گیا ہے۔ میری ماں تو اس دنیا میں نہیں مگر یہ کس کا ہاتھ ہے جو مایوسیوں کے ہجوم میں میرے سر پر آہستہ آہستہ پھرنے لگتا ہے۔ یہ کس کی انگلیاں ہیں جو میرے گیلے گالوں کو چھونے لگتی ہیں اور میرے سارے آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ یہ کس کا چہرہ ہے جو میرے غم کی تاریکیوں میں طلوع ہو کر ہر طرف میرے تفاخر کی روشنی بکھیر دیتا ہے 'یقیناً ماں جی' ہاں ہاں ماں جی ہیں!

دل کی جن سے تھیں بستیاں آباد
اب کہاں ہیں وہ ہستیاں آباد

(والدہ محترمہ کی ۲۴ ویں برسی کے موقع پر)